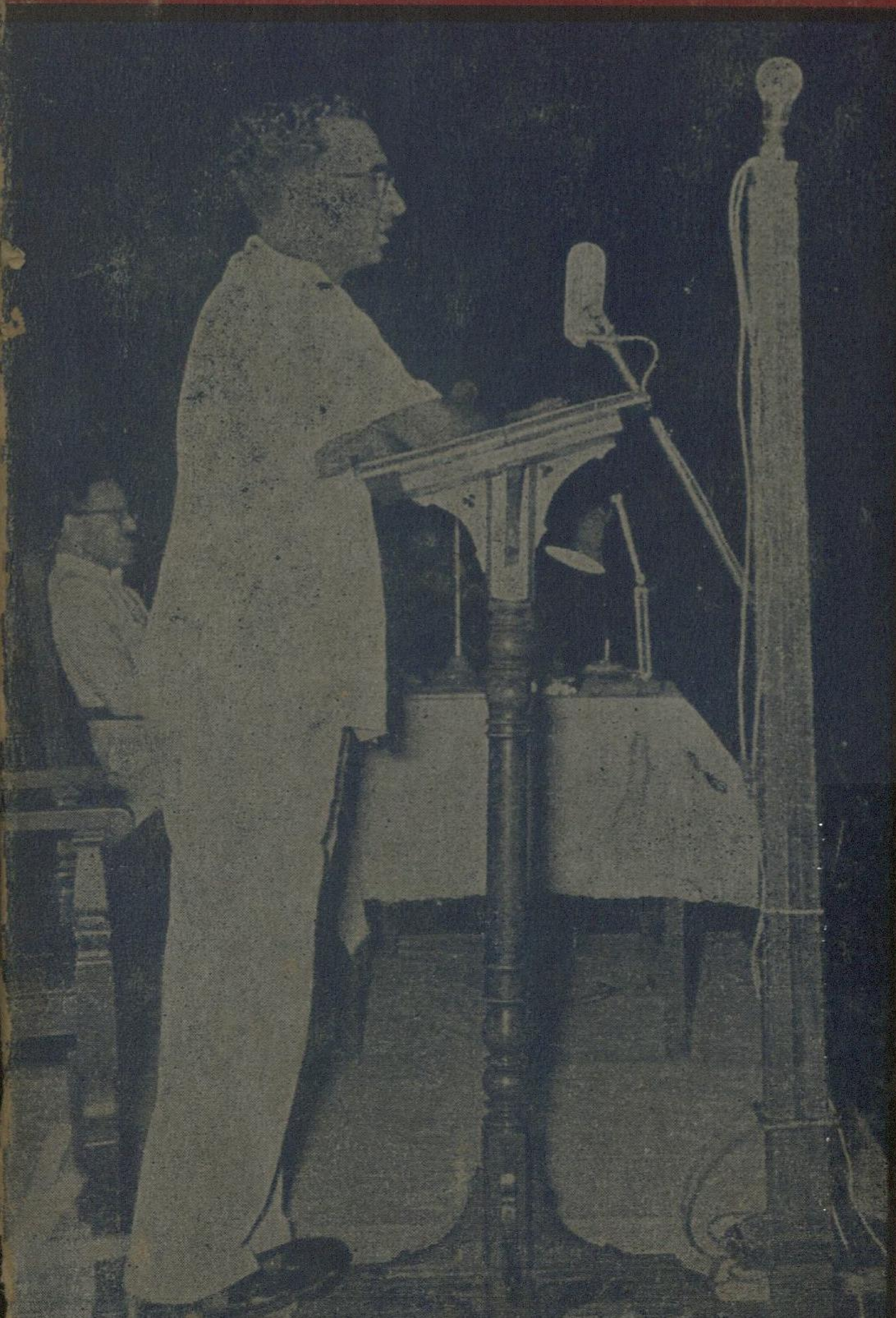
جگن ناتھ آزاد
اور
اُس کی شاعری



مرتبہ
حمیدہ سلطان احمد

جگن ناتھ آزاد

اور اُس کی شاعری

جگن ناتھ آزاد

اور اُس کی شاعری

حمیدہ سلطان احمد

مکتبہ شاہراہ - دہلی

پہلی بار ۱۹۶۴ء

تعداد ایک ہزار

قیمت پانچ روپے

طابع:- یونین پرنٹنگ پریس، اردو بازار دہلی

فہرست

مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
پیش نامہ	حمیدہ سلطان احمد	۹
شخصیت اور شاعری		
ابتدائیہ	فراق گورکھپوری	۳۳
جگن ناتھ آزاد	اشرف قادری	۳۸
آزاد کی شاعری	نازش پرتاپگڑھی	۵۶
جگن ناتھ آزاد کی شاعری	کلام حیدری	۷۲
آزاد کی شاعری	نریش کمار شاد	۹۱
جگن ناتھ آزاد	اشرف بھوپالی	۱۰۷

صفحہ	صاحبِ مضمون	مضمون
۱۲۰	سعید سہروردی	جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری
۱۳۱	گوہر سعیدی ٹونکی	جگن ناتھ آزاد
۱۴۶	ارشد کاکوی	جگن ناتھ آزاد
		تصانیف
۱۶۷	خواجہ احمد عباس	بیکراں پر ایک نظر
۱۷۳	مخمور جالندھری	بیکراں
۱۸۳	حامد علی خاں	جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام
۱۹۲	(سر) عبد القادر	نذرِ اقبال
۱۹۵	کرشن موہن	بیکراں
۲۱۱	عبد الحمید عدم	بیکراں کی چند نظمیں
۲۱۸	شہاب ملیح آبادی	بیکراں
۲۳۱	ذوالفقار عظیم	ستاروں سے ذروں تک
۲۳۹	آل احمد سرور	ستاروں سے ذروں تک

مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
میرا موضوعِ سخن	مانی جائسی	۲۴۵
آزاد کا نیا مجموعۂ کلام	تیغ الٰہ آبادی (مصطفےٰ زیدی)	۲۵۱
ستاروں سے ذرّوں تک	غلام رسول نازکی	۲۵۸
وطن میں اجنبی	عبدالمجید سالک	۲۶۷

پیش نامہ

آزادی کے سہانے خواب کی تعبیر دلی کے لئے بڑی دل شکن آئی۔ اس کی گود کے پالے انگریز دلی کی گود خالی کر گئے اور جو باقی رہے وہ اس ہنگامہ میں ۱۸۵۷ء کے خونی دور کو بھی بھول گئے۔ آخرکار ہندوستان کی عظیم ترین ہستی نے اپنی جان دلی کو تباہ ہونے سے بچانے کی خاطر قربان کر دی اور اس بڑے انسان کی شہادت کے بعد یہ طوفان تھم گیا۔ دلی والوں نے پھر سکھ کا سانس لیا۔ اس قیامت میں شکر ہے ہم لوگ دلی میں نہ تھے۔ حسب معمول شیلانگ گرمیاں گزارنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ وہیں دلی کی بربادی کی خبریں ملتی رہیں۔ ہمارا گھر بھلا اس دار و گیر میں کیسے بچتا۔ وہ بھی لٹا اور میں دلی اجڑنے اور اپنی قیمتی قلمی کتب کے ضائع ہونے پر شیلانگ میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ جی یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح دلی پہنچ جاؤں۔ لیکن بھلا ان حالات میں مجھے کون دلی آنے دیتا۔ امن بھی ہوتے ہی ۱۹۴۷ء

کے اکتوبر میں اور گھر والوں کے ہمراہ میں دلّی پہنچ گئی۔ ویسے تو دلّی اب بھری پری نظر آتی تھی لیکن ماحول بالکل بدلا ہوا سا تھا۔ ہر جانب نئی صورتیں دکھائی دیتی تھیں اور فضا اُداس سی تھی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستیں ڈاکٹر عبادت بریلوی دلی کالج میں ان دنوں کرتے تھے اور وہاں اکثر پنجابی شاعر و ادیب بھی آجاتے تھے اور ہم سب مل کر اس کی پریشان حالی کا ماتم کرتے رہتے تھے کہ خبر ملی اُردو کو بھی دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ علّامہ کیفی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے عرض کیا "قبلہ اجازت دیجئے آپ کی سرپرستی میں اردو مجلس قائم کی جائے تاکہ اردو کے تحفظ کے لئے کچھ کام ہو سکے۔" کیفی آنجہانی کا وجودِ بابرکت اس لامحدود اندھیرے میں منارۂ نور کے مانند تھا۔ اگلے وقتوں کے آدمی اور اس دلّی کے شیدا تھے جہاں ہندو مسلمانوں نے مل کر اردو کو کنگھی چوٹی سے سنوارا ان کو اس انقلاب پر حیرت بھی تھی اور افسوس بھی۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی دہلی کے بعض اور ادب دوستوں کی امداد بھی شاملِ حال ہوئی۔ اور اردو مجلس ہارڈنگ لائبریری میں باقاعدہ جم گئی۔ اس کی نشستوں میں دلّی کے ادیبوں شاعروں سے زیادہ پنجاب والے آتے تھے۔ غالباً نومبر ۱۹۴۹ء کا مہینہ تھا اس دن انجمن کے اراکین میں میرے اور علّامہ مرحوم کے علاوہ اور کوئی کافی وقت گذر جانے پر بھی نہیں پہونچا تھا۔ علّامہ سرنگوں بیٹھے غالباً اس ادبی چہل پہل کے زمانہ کو یاد کر رہے تھے جب دلّی کے ہر دیوان خانے میں شعر و ادب کے تذکرے رہتے

تھے اور میں یہ سوچ کر گھبرا رہی تھی کہ شاید آج کوئی بھی نہیں آئے گا۔ قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں نے نظر اُٹھائی اک کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا نوجوان جس کے خط و خال سے ذہانت ٹپک رہی تھی مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر لئے کالی شیروانی زیبِ تن کئے کالے فریم کا چشمہ لگائے سامنے کھڑا تھا۔ اس نوجوان نے پہلے علّامہ کیفی کے سامنے جھک کر ادب سے سلام کیا اور پھر مجھے۔ کیفی صاحب نے مسکرا کر کہا "آؤ آزاد آؤ۔ شکر ہے یہاں کا سکوت تو اب ٹوٹا، ہاں بھئی سناؤ کوئی اپنی تازہ چیز"۔ اور آزاد نے بہت خوب کہہ دوزانو بیٹھ کر سنانا شروع کیا

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

آزاد کا دل کش سوز میں ڈوبا ہوا ترنّم مجھے بہت اچھا لگا۔ ان کے شائستہ انداز اور نستعلیق طور طریقوں نے مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ ان کا شمار بھی مالِ غنیمت میں ہے جو پنجاب سے دلّی کو ملا ہے۔ اس کے بعد اکثر آزاد اُردو مجلس کی نشستوں میں شریک ہوتے اور جانِ محفل بنے رہتے۔ میں فطری طور پر رکھ رکھاؤ کی ایسی عادی ہوں کہ اکثر لوگوں سے بہت دنوں تک ملتے رہنے کے بعد بھی کُھل کر بات نہیں کرتی اور بہت لئے دیئے رہتی ہوں۔ لیکن چند شاعر اور ادیب ایسے بھی ہیں جو کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی میرے بے تکلّف دوست بن جاتے ہیں۔ میری پسندیدہ ادبی شخصیتوں میں آزاد کا شمار بھی

ہے۔ ۱۹۵۱ء سے تو آزاد انجمن ترقی اردو کی شاخ دہلی کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے میرے ادبی کاموں میں ایک ساتھی ہیں۔

ملنے کے چند مہینے بعد ہی آزاد نے مجھے آپا جان کہنا شروع کر دیا تھا اور میں بھی چھوٹے بھائیوں کی طرح آزاد کو چاہتی ہوں۔

والدہ صاحبہ مرحومہ کے تو آزاد بہت چہیتے تھے۔ وہ ان سے اکثر شعر سنتیں اور خوش ہوتیں۔ آزاد کبھی کبھی مشاعروں کے چکر میں پھنس کر بہت دنوں تک نظر نہ آتے تو مرحومہ ناراض ہو کر فرماتیں" اے نوج آج کل کے مشاعرے بھی موئے جان کا عذاب ہو گئے ہیں۔ خدا جانے یہ آزاد کہاں مارا مارا پھر رہا ہے کہ مہینوں سے شکل بھی نہیں دکھائی" اور جب آزاد کو اس خفگی کی خبر ملتی وہ فرصت پاتے ہی ایک محبوب مسکراہٹ لبوں پر لئے ہمہ تن انفعال بنے موجود ہو جاتے اور ان کی صورت دیکھتے ہی فرمائشوں کی بوچھار شروع ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ فرماتیں" ہاں سلام سناؤ"۔ آزاد ہو دیانہ انداز سے سلام پڑھتے۔ میں کہتی بھئی میں تو وہ پٹنے کے مشاعرے والی غزل سننا چاہتی ہوں" اور خجستہ فرمائش کرتیں" ہمیں تو آپ کی وہ چیز بہت پسند ہے

تری بزم طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یاد ایام بہاراں لے کے آیا ہوں"

شریں اختر بھولا منہ بنا کر کہتی "چھوٹی بہن کی بھی تو سن لیجئے! بھائی مجھے تو وہ غزل بالکل حقیقت معلوم ہوتی ہے

اے دل الجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں

بس میں تو وہی سنوں گی اور بملا بھابی کے کان آپ کے خلاف بھروں گی۔"

آزاد مسکرا کر کہتے "اچھا بہت اچھا" اور دل نشین انداز میں سب کی فرمائشیں پوری کر دیتے۔

کوئی شاعر بھی اس دور میں وقتی تحسین و ستائش کے سہارے زیادہ دن نہیں چل سکتا جب تک اس کے کلام میں حقائق نہ ہوں۔ غمِ دوراں میں پھنس کر آج کا انسان غمِ جاناں کو بھول سا گیا ہے اس لئے اب ہمارے شعر و ادب سے بھی رندی و سرمستی کے عناصر بالکل خارج تو نہیں ہو گئے لیکن اب ذوق بالکل بدل گیا ہے۔ اس ماحول میں صرف چھلکتی ہوئی گمروں اور تھرکتے ہوئے قدموں کی کہانی سنانے والا شاعر پنپ نہیں سکتا۔ آزاد صرف رسمی شاعری نہیں کرتا بلکہ ان طوفانوں سے بھی کھیلتا ہے جو انقلاب کے دھارے میں بہا کر اس کو کہاں سے کہاں لے آتے ہیں۔ قدرت نے آزاد کو حساس دل بھی دیا ہے اور متفکر دماغ بھی۔ صحیح روحانیت کے ساتھ پاکیزگیٔ تخیل اور حسنِ بیاں کی دولت سے بھی آزاد کی شاعری مالا مال ہے۔

موجودہ دور کے اضطراب نے آزاد کو رومان کی وادیوں میں گھومنے کے لئے زیادہ وقت نہیں دیا۔ اس دوران جب ہر طرف بھیانک حقیقتیں مونھ پھاڑے ڈائن کی طرح کھڑی ہیں تو کوئی متفکّر انسان رومان کی افیون کھا کر غافل نہیں رہ سکتا۔ لیکن اقبال کے مدّاح خواں اور پنجابی ہونے کے باوجود آزاد کی شاعری اقبال سے متاثر نہیں ہے۔ آزاد کا لب و لہجہ دل نشیں انداز، ایک معتدل مزاج انسان کی تصویر ہے بپھرے ہوئے انقلابی کے روپ میں آزاد کبھی نظر نہیں آتے۔ آزاد کی شاعری میں درد آمیز گھلاوٹ ہے، ہلکی سی افسردگی ہے اور یہ کیفیت ۱۹۴۷ء کے بعد کی نظموں میں اور بھی زیادہ ہے جب آزاد کو تقسیمِ ہند کے بعد بہ مجبوری اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ لیکن چونکہ آزاد کا شعور پختہ ہے اس لئے اُس افسردگی کے باوجود ان کی شاعری میں خود اعتمادی کا جذبہ بھی ہے۔ اردو سے آزاد کو عشق ہے حالانکہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے مگر ان کو اردو سے لگاؤ اتنا ہے جیسا کسی اہلِ زبان کو ہونا چاہیئے اُدھر ان کا لب و لہجہ بھی دلی والوں کا سا ہے۔ یہ رائے صرف میری نہیں اردو کے اور بلند پایہ ادیبوں کی بھی ہے۔

آزاد کی طویل نظم 'اردو' جواب چھپ چکی ہے اور جس کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے انجمن ترقیٔ اردو شاخ دہلی کے سالانہ جلسہ ۱۹۵۲ء میں آزاد

نے پڑھی تھی۔ ہندوستان کے اکثر مشاعروں میں یہ نظم آزاد سے فرمائش کرکے سنی گئی اور پسند کی گئی۔ اس نظم کے متعلق قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے فرمایا تھا:

"یہ نظم جواب شائع ہوتی ہے اردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اردو ہے یا میں انجمن ترقی اردو کا سیکرٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا ایک جزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اس کے چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کرکے انکار کر دینا ان کو باطل نہیں کر سکتا۔ تاریخ کے گواہ تصنع پسند اور سخن ساز سیاست کی سخت ترین ضربیں کھا کر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔

"آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فتنہ کی آگ میں گذر کر اور آوارۂ وطن ہو کر ہندوستان آئے اور پھر بھی ادنیٰ تعصبات کی اس گندگی سے

انھوں نے اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔

یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام ہے۔ ایک ایسے شاعر کی آواز

کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو غیب کی آواز ہے

وہ تو زندگی کی ایک نوید ہے!"

آزاد کی شاعری جدید ہے اور ارتقاء پسند۔ اس ادبی آشوب کے زمانے میں اُن گنتی کے شعراء میں آزاد کا شمار کیا جاتا ہے جن کی قادر الکلامی کا سکّہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ آزاد کی وہ نظمیں بھی جو خالص سیاسی ہیں لوچ اور دل کشی سے برہنہ نہیں بعض دوسرے نوجوان شعراء کی طرح ان کا لہجہ کبھی کرخت نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سخت سے سخت بات بھی شیریں اور دلاویز انداز میں کرتے ہیں۔ مجھے دراصل آزاد کی شاعری پر تنقید کرنا نہیں، ہیں تو آزاد کی دل کش شخصیت کا تعارف کرا رہی تھی۔ لیکن ہر لکھنے والے کی تحریریں اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہیں اس لئے مجھے بھی آزاد کی شاعری کا ذکر سرسری طور پر کرنا پڑا۔ آزاد کی متعدد نظموں سے ان کے عالی ظرف اور صاف دل ہونے کا اعلان ہوتا ہے "بھارت کے مسلمان"، "شہادتِ حسین"، "اے کشورِ ہندوستان"، "تقسیم پنجاب"، "اجنتا کے غاروں میں"، "دہلی کی جامع مسجد"، "بہادر شاہ ظفر" اور "گاندھی" یہ نظمیں صرف بلند پایہ ادبی شاہکار ہی نہیں بلکہ آزاد کے فکرِ بلیغ اور صاف ذہن کی ایسی روشن تصویریں ہیں

جن کی تابانی سے اردو ادب کی فضا منوّر ہو رہی ہے۔ اس وقت ہند و پاک کے چند رسائل میرے سامنے ہیں۔ ایک نظر ان کے اقتباسات دیکھئے جن سے میرے ان خیالات کی بڑی حد تک تائید ہو رہی ہے۔

"جگن ناتھ آزاد بھارت کا نوجوان شاعر جو پنجاب کے نغمے گاتا ہے

اس کا جسم دلّی میں ہے اور روح لاہور میں - وہ پنجاب کا بیٹا تھا وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا - دلّی اس کا نیا وطن ہے مگر پُرانے وطن کی یاد جب زیادہ ستاتی ہے تو وہ اپنے وطن میں آ جاتا ہے جہاں اب وہ "پردیسی" ہے - اسی ہفتے وہ لاہور آیا - میاں بشیر احمد سابق سفیر ترکی نے اس کے چند احباب اور رفیقوں کو اس سے ملاقات کرنے کے لیئے جمع کیا - ان میں جسٹس رحمان جسٹس جان، خلیفہ عبدالحکیم، حکیم احمد شجاع اور چغتائی صاحب ایسے بزرگ بھی تھے، اور نوجوان شاعر بھی - چند پروفیسر اور صحافی بھی تھے - ان سب نے آزاد کا کلام سُنا - سُنا ہُوا کلام بھی سُنا اور آزاد کے اخلاص کی تاثیر تھی کہ لوگ چاہتے تھے کہ سُنیں اور سنتے جائیں مگر وہ تھک گیا - وہ چاہتا تھا کہ دوسرے شعراء حضرات بھی کچھ پڑھیں۔ اور کئی شاعر پڑھنے کے لیئے پر تول کر صوفوں پہ بے قرار بھی تھے - مگر چند دُور اندیشوں نے اس محفل کو مشاعرہ بننے سے روک لیا - اور جب

حکیم احمد شجاع صاحب آزاد کے پاس آکر بیٹھے اور فرمایا کہ مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ آپ حضرت محروم کے فرزند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(قندیل لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء)

" جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام ۔ ۱۵ ۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو الحمرا (لاہور آرٹ کونسل) کے زیر اہتمام منعقد شدہ ایک محفل ایسی پُر سکون اور منفرد محفل کہی جا سکتی ہے جو شعر و ادب کے شائقین کو موجودہ دور میں بہت کم میسر آتی ہے ۔ 'آج کل' کے ایڈیٹر جگن ناتھ آزاد اور پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی انجمن ترقی اردو کی گولڈن جوبلی میں شرکت کی غرض سے کراچی جاتے ہوئے دو ڈھائی گھنٹے کے لئے لاہور بھی ٹھہرے اور اسی دوران میں یہ محفل بھی برپا ہوئی ۔ جگن ناتھ آزاد کو تقسیم ملک کے دور کا سب سے بڑا شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ انھیں ملک کے ساتھ تہذیب و تمدن ، زبان و قلم اور سب سے زیادہ دلوں اور محبتوں کی تقسیم و تفریق کا شدید احساس ہے ۔ برسوں کی جمی ہوئی جڑیں اکھیڑنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کا بیان جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا موضوع ہے ۔ اور

اسے انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنایا ہے۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر دلی پہنچ چکے ہیں۔ ان کے راوی اور چناب کے پیدا کردہ پر جوش بےباک اور نڈر جذبات میں اب گنگا جمنا کی پروردہ تہذیب کی جلا شامل ہو گئی ہے۔ ان کا خالص ہندوستانی طرز کی شیروانی پہنے وضع دار مشرقی لوگوں کی طرح وارد ہونا انگریزی لباس کے دلدادہ مہمانوں پر ایک طنز معلوم ہو رہا تھا۔

وطن میں ایک غریب اللہ یار آتا ہے
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

یہ شعر انھوں نے بعد میں سنایا مگر دیکھنے والے آزاد کی ایک ایک ادا سے ایک " غریب اللہ یار " کے جذبات پڑھ رہے تھے۔ وہ نئے نئے چہروں کے درمیان کھویا ہوا سا آکر کھڑا ہو گیا اور یکایک پچھلی سیٹوں پر احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کو دیکھ کر ان سے لپٹ گیا۔ "

(زینتِ راوی " لاہور یکم نومبر ۱۹۵۳ء)

" چند روز ہوئے رات کے دس بجے انارکلی کے ایک چھوٹے سے چائے خانے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں آزاد بھی تھا۔ وہ

تمام دن جو تیں کھانے اور شعر سنانے کے بعد تھک ہار کر یہیں آ بیٹھا تھا۔ وہاں چند دوست پہلے سے جمع ہو گئے تھے۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے لوگ آتے جاتے۔ چائے پیتے اور چلے جاتے۔ کسی کو احساس تک نہ ہوتا کہ ہوٹل میں ایک ہندو بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد نہ ہندو ہے نہ مسلمان وہ ایک انسان ہے اور ایک شاعر۔ چونکہ وہ انسانیت کا شاعر ہے اس لئے بڑا شاعر ہے۔ وہ اردو کے مسلّم الثبوت شاعر تلوک چند محروم کا بیٹا ہے اور بقول سردار جعفری شاعری اسے ورثہ میں ملی ہے لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہے۔ وہ زندگی کی رفتار کا ساتھ دے رہا ہے اور شعر کی نئی قدروں کا نقیب ہے......"

(ہفت روزہ "برق" لاہور
سال نامہ ۱۹۵۴)

"پچھلے دنوں دہلی سے پاک و بھارت کے مقبول شاعر جگن ناتھ آزاد پاکستان تشریف لائے تھے اور پاکستان کے ہر شہر میں ان کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ حاضرین نے ان کے کلام کو جی کھول

کر شنا اور جی کھول کر داد بھی دی تھی۔ آزاد کو 'پنجابی' تقسیم سے پہلے کا جانتا ہے۔ تقسیم نے کئی دلوں میں جدائی کی ایک آگ سی سلگائی ہے۔ اور اس آگ کے سب سے بلند شعلے جگن ناتھ آزاد کے دل میں روشن ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ پاک اور بھارت میں بے حد مقبول ہیں۔ اور ان کا کلام ایک بار پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں ....."

(پندرہ روزہ "احساس" لاہور
۲۵- نومبر ۱۹۵۳ء)

"مشاعرے کی مختصر کارروائی میں جو تشنگی کا احساس باقی تھا اسے آخری شاعر جگن ناتھ آزاد نے پورا کر دیا۔ پروفیسر تلوک چند محروم کے صاحبزادے آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی شاعری میں جذبۂ حبِ وطن کی حلاوت ہے۔ ان کے اشعار سے وطن کی محبت اس حد تک ٹپکتی ہے کہ ہر شخص کو ان کی وطن سے دوری شاق گذرتی ہے۔

آزاد صاحب نے اپنی مشہور طویل نظم میں تقسیمِ ملک کے واقعات جس انداز میں بیان کئے ہیں ان سے ہر شخص اس جنون پر ندامت محسوس کرتا ہے۔ بے حد ندامت کے بعد ان کی آواز کے ارتعاش میں گھُلی ہوئی برادرانہ محبت کے جذبات ہمارے ضمیر کو مجبور کر دیتے ہیں کہ اٹھ کر ان سے لپٹ جائیں اور کہیں۔ "آزاد صاحب! آپ اجنبی نہیں۔ آپ کی طرح ہمیں بھی گذشتہ واقعات نے بہت دُکھ پہنچایا ہے۔ آیئے۔ اب تلافی کر دیں اور بھائیوں کی طرح رہیں۔' جگن ناتھ آزاد نے اپنے کلام کے تاثر سے رفاقت کا جو جذبہ بیدار کر دیا ہے اس کی بنا پر انھیں ہم دونوں ممالک کے درمیان "امن اور خیر سگالی کا رابطہ" قرار دے سکتے ہیں۔ جب آپ نے اپنی نظم کے چند بند پڑھے تو دل پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمھارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

آزاد اپنی نظم میں کہتے ہیں

وطن کو یہ پیام جانفزا دینے کا وقت آیا
کہ اب بچھڑوں کو آپس میں ملا دینے کا وقت آیا
سیاست سے کہیں ہے رتبۂ انسانیت اونچا
یہ بات اہلِ سیاست کو سُنا دینے کا وقت آیا ....."

('اقدام' لاہور

۱۲- دسمبر ۱۹۵۴ء)

"کل کے مشاعرے میں بھارت کے شاعر جناب آزاد نے (جن کا وطن پنجاب ہے) پاکستان کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اور جس بلند حوصلگی اور خلوص کے ساتھ پاکستان کا ذکر کیا ہے وہ نہ صرف ان کے اپنے جذبات تھے بلکہ وہ بھارت کے عام آدمیوں کی ترجمانی بھی تھی اور ان جذبات کا مؤثر نہ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ یہ وہ دلی جذبات تھے جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہیں۔ محبت کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔ محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ عالمگیر ہے وہ دوامی ہے۔ وہ پاسپورٹ بلکہ دار و گیر کے بندھنوں سے بھی

بے نیاز ہے۔۔۔۔"

(اقبال، کراچی
۲۱۔اکتوبر ۱۹۵۳ء)

"لیجئے اب جگن ناتھ آزاد آتے ہیں۔ آزاد صاحب سال میں دو
تین پھیرے پاکستان کے ضرور کرتے ہیں۔ اور ان کی شاعری میں جو
سوز اور گھلاوٹ بڑھ رہی ہے اس میں احساسِ وطن کا بڑا حصہ ہے
اور پھر پڑھتے بہت خوب ہیں۔ ایک دو شعر سنیئے۔

"سنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ منزل کو بھی ہم تو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
ہمیں نے اے محبت قدر پہچانی ہے کچھ تیری
تجھے طوفاں تجھے کشتی تجھے ساحل سمجھتے ہیں

("قومی زبان" کراچی
یکم دسمبر ۱۹۵۴ء)

"حضرت جگن ناتھ آزاد جو اپنے سفر کی تکان دور کرنے کے لئے
لیٹے ہوئے تھے ہم لوگوں کو دیکھتے ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اُٹھ

کھڑے ہوئے اور ملے - پھر کیا تھا - آزاد صاحب سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا - کبھی امراؤتی کے احباب اور شعراء کا تذکرہ رہا تو کبھی اُردو کے بقاء و تحفظ کا مسئلہ - بہر حال میں نے آزاد صاحب کے دل میں اردو کے لئے تڑپ اور اس کی بقاء و تحفظ کا بے پناہ جذبہ موجزن پایا - یہ بھی دیکھا کہ مشاعرے کے دوران میں صدر کی حیثیت سے اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے حاضرینِ مشاعرہ میں اردو سے ہمدردی کا جذبہ کس طرح بیدار کرتے رہے ......"

(الفاروق کامٹی

۲۹- دسمبر ۱۹۵۳ء)

" ۲۲- نومبر کی رات کو پریدرشنی (نمائش) میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں سب سے اچھی دین جگن ناتھ آزاد کی ہوئی - ان کی کہی ہوئی چیزوں نے سننے والوں کو اونچے نیتک کھراتل پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ مست بھی بنا دیا ..."

(ہندی دینک "پرتاپ" کانپور

۲۸- نومبر ۱۹۵۲ء)

"تقسیمِ ہند اور اس کے پیدا کردہ فرقہ وارانہ فسادات نے لاکھوں انسانوں کے جان و مال کی کثیر قربانی لی اور انھیں اپنا گھر بار چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ اس تباہی کا جو لوگ شکار بنے ان کا ہوش و حواس کھو بیٹھنا اور ایک طرح کی فرقہ وارانہ تنگ نظری اختیار کر لینا ایک حد تک فطری تھا۔ لیکن جگن ناتھ آزاد ان لئے گنے چنے وسیع النظر افراد میں سے ہیں جنھیں اس سیاسی انتشار اور ذہنی پریشانی کا نشانہ بن کر اپنا وطنِ عزیز ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا لیکن پھر بھی ان کے زاویۂ نظر اور اندازِ فکر میں ذرا سا بھی فرق نہ آنے پایا بلکہ آزاد نے تو اس ہنگامۂ قتل و غارت سے ایک طرح کی 'تعلیمِ روحانی' حاصل کی۔

تقسیمِ ہند کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے جگن ناتھ آزاد کو اپنا وطنِ عزیز مغربی پنجاب بادلِ ناخواستہ چھوڑنا پڑا۔ تقسیمِ ہند کی تباہ سامانی آزاد کی زندگی کا سب سے بڑا المناک حادثہ تھی جس نے ان کے قلب و نظر پر ایک ایسا گہرا نقش چھوڑا ہے جو ان کے کلام کے بڑے حصّے سے جھلکتا ہے۔ اسی

پچیز نے ان کے کلام کو سوز و گداز اور انسانیت سے معمور کر دیا ہے ۔"

("سیاست" حیدرآباد

۸- اکتوبر ۱۹۵۶ء)

"سیاست سے کہیں ہے رتبۂ انسانیت اونچا
یہ بات اہلِ سیاست کو سُنا دینے کا وقت آیا"

کہنے والا شاعر پیغمبرِ انسانیت ہے ۔ اس ہنگامی دَور میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی بہت ضرورت ہے جو عوام کے مشتعل جذبات کو محبّت کے نغموں سے ٹھنڈا کر دیں اور آزاد کی والہانہ شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد سے یہ کام برابر انجام دے رہی ہے ۔ آزاد کی معصوم فطرت اور عالی ظرفی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ آسمانِ ادب پر ایک درخشندہ ستارہ چمکا ہے جس کی تابانی روز افزوں ہے ۔ جس طرح جواہر لال نہرو نے اپنے محترم والد موتی لال نہرو کے نام کو اپنے بے نظیر کاموں سے اُجاگر کیا ۔ اسی طرح جناب تلوک چند محروم کے نام کو اُن کے اکلوتے ہونہار لائق فرزند جگن ناتھ آزاد نے اپنی ادبی شہرت سے چار چاند لگا دئیے ہیں ۔

آزاد مجلسی آداب کے بہت قائل ہیں اور آپ بالکل پسند نہیں کرتے کہ کسی شاعر کے کلام سنانے کے دوران میں بے موقع بات کی جائے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر

کسی نے۔ ایسے موقع پر بے محل بات کی تو آزاد کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ پھر ان کی مسکراتی ہوئی صورت پر ایک دم سنجیدگی کا غبار چھا جاتا ہے اور وہ اپنا کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی کتنا بھی منائے وہ نہیں سنتے۔ ان دنوں فقرے بازی بے موقع مذاق اور بے محل بات چیت کرنے کا ایک سلسلہ مشاعروں میں چل گیا ہے۔ حالانکہ مشاعرے ہماری تہذیب اور کلچر کا ایک بہت بڑا نشان ہیں۔ وہاں اس قسم کے مظاہرے اور عامیانہ انداز کے مذاق بالکل اچھے نہیں لگتے۔ لیکن خدا جانے کیوں یہ وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ اور خود شعراء چونکہ اکثر نشے میں پی کر بہکے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے صورت حال ہی ابتر ہوتی ہے۔ جب ہمارے شعراء جو قوم کے کردار بنانے کا دعوے کرتے ہیں خود ہی اپنے حال سے غافل ہوں تو اور کسی کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آزاد کو میں نے کبھی نشستوں میں یا ادبی مشاعروں میں ناشائستہ فقرے بازی کرتے نہیں دیکھا۔ خود کو انھوں نے ابھی تک اس روشِ عام سے الگ رکھا ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں آزاد نے ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے۔ یقین ہے کہ عمر کے ساتھ ان کا شعور ترقی کرے گا اور فن بھی۔

میں اپنے اُن ساتھیوں کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں مجھے ہر طرح مدد دی اور اپنے پُر خلوص مشوروں سے میرے کام کو آسان

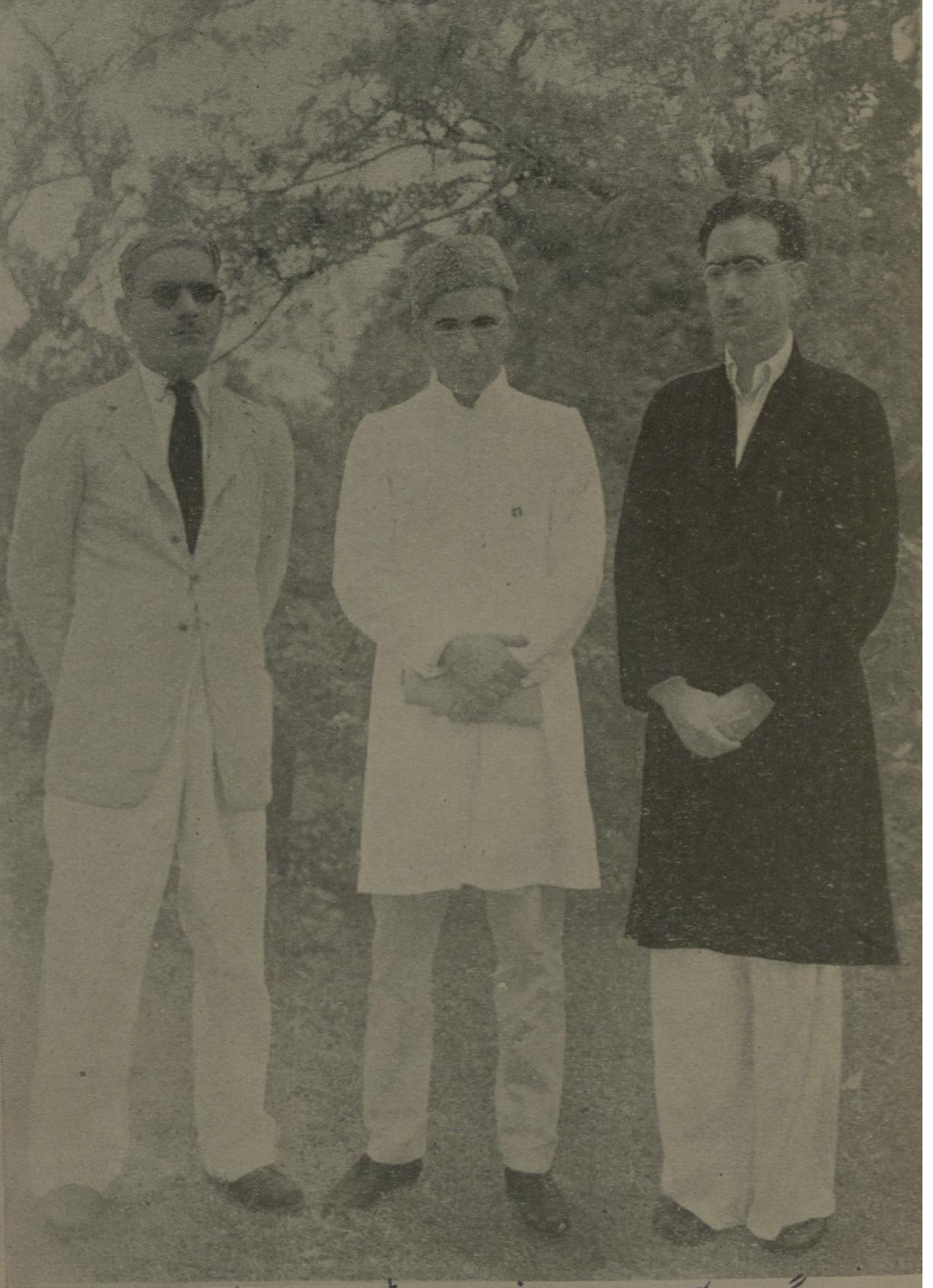
بنا یا دہلی۔ کے بعض ادیبوں کی بھی میں ممنون ہوں جنہوں نے آزاد کی شاعری پر ایک کتاب مرتّب کرنے کی تجویز میرے سامنے رکھی۔ یہ کام میرے لئے بہت خوش گوار اور میری مرضی کے عین مطابق ہے۔ آزاد کی شاعری سے اردو ادب کی بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی لگن سے گیسوئے اردو سنوارتے رہیں۔

آمین ثم آمین

حمیدہ سلطان احمد

۲۵۔ مارچ ۱۹۵۷ء

شخصیت اور شاعری



جگن ناتھ آزاد   ابوالاثر حفیظ   پنڈت ہری چند اختر

چاٹگام (مشرقی پاکستان) میں اپنے میزبان جناب احمدالدین اظہر کے دولتکدہ پر

ابتدائیہ

فراق گورکھپوری

سچّے معنوں میں بحیثیتِ شاعر مشہور ہونا ہر دور میں ایک مشکل امر رہا ہے۔ فصیح اور بے عیب لکھنے والوں کی اکثریت بھی مشہور نہیں ہو سکی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ شروع میں تو نام اُچھلا اور نگاہیں اُٹھیں لیکن شہرت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ کامیابی ایک عام بدنصیبی ہے۔ لیکن کم عمری میں کامیابی نصیب ہونا سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ بہرحال شاعری میں ایسی کامیابی جو ثابت قدم بھی ہو اور ترقّی پذیر بھی، کم یاب ہے۔ پھر جب ہم دورِ حاضر کی بلند پایہ اُردو شاعری کے نمونوں اور مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی شاعر کا اپنے لئے خاص جگہ پیدا کرنا ہر لحاظ سے قابلِ توجّہ کارنامہ ماننا پڑتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے دورِ حاضر کی اُردو شاعری میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس کا

ہر صاحبِ ذوق کو بخوبی اور بے تکلّف اعتراف ہوگا۔

فرانس کے سب سے بڑے نقّاد سین بیُو نے کہا ہے کہ جب میں کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو پہلے اس کتاب کے ادبی و فنّی و فکری محاسن پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مصنّف کتنا اچھا آدمی ہے نیکی و شرافت جو زندگی کے سب سے بڑے جوہر ہیں، ادب و شاعری کے بھی سب سے قیمتی جوہر و عناصر ہیں۔ حقیقی ادبی تخلیق حقیقت میں ایک اخلاقی عمل ہے۔ آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور سب سے زیادہ دل کش ہے وہ آزاد کی وہ نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنّع کا نام نہیں۔ زندگی کا یہ خلوص ہی آزاد کی شاعری کا محرّک اور خلّاق ہے۔ آزاد کے خیالات اور ان کے لہجے میں سچّی انسانیت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے اور این سعادت بزورِ بازو نیست۔

آزاد بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد تلوک چند محروم جتنے اچھے اور پختہ کار شاعر ہیں اُتنے ہی اچھّے اور قابلِ احترام انسان بھی ہیں۔ آزاد نے بلند سے بلند جو مغربی و مشرقی تعلیم و تہذیب اس زمانے میں حاصل کی جا سکتی ہے اُسے کامل طور پر حاصل کیا ہے۔ لیکن ان کی تربیت میں غالباً کیا یقیناً جس چیز نے سب سے بڑا حصّہ لیا ہے وہ حضرتِ محروم کی "نظر" نے اور اُن کے سنجیدہ کردار کی خاموش

فضا اور ماحول نے ایسے غیر شعوری اثرات زندگی کو سنوار دیتے ہیں۔ آزاد بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن اُن کی بلند تعلیم اس مرکزی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ایسے جوانِ صالح اس دور کے لیئے اور ہر دور کے لیئے مایۂ ناز ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آزاد کی انسانیت پر رشک کیا جائے یا قابلیت پر یا اُن کی اس شاعری پر جو نہ جانے کیوں رہ رہ کر دلوں کو کھینچتی ہے۔

آزاد کی غزلیات، رُباعیات، قطعات اور منظومات کو خواہ سرسری طور پر کوئی پڑھے خواہ غائر طور پر، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کی آواز بیک وقت نرم، متوازن اور مردانہ وار ہے۔ لہجہ بیک وقت سنجیدہ و حسّاس ہے۔ خیالات، جذبات، قلب و نظر اس تربیت و تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ الفاظ و بیان میں قابلِ رشک شُستگی ہے۔ ان کے ہر شعر کے آئینے میں ان کا کردار جھلک رہا ہے اور ان کے سجل دل و دماغ بھی۔ سَو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اُن کا کلام برابر ترقّی کرتا ہُوا نظر آتا ہے۔ سطحیّت تو ان کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جا رہی ہیں، ایک بلندی جو نئی منزلیں تلاش کر لیتی ہے، ایک ایسی تنقیدِ حیات جو سادہ و پُرکار ہے، ایک ایسا اندازِ بیان جو چونکہ بے تصنّع ہے اس لیئے بے حد دل کش ہے، زندگی سے، انسانیت سے، کائنات سے

فطری اور پُر خلوص لگاؤ، ایک چوٹ کھایا ہوا دل جس نے اپنی چوٹ کو قبول کرلیا ہے یہ ہیں وہ خصوصیات جو آزاد کی شاعری کو امتیازی رنگ عطا کرتی ہیں۔

تقسیمِ ہندستان نے حضرتِ محروم سے ضعیفی میں اور آزاد سے جوانی میں اُن کا محبوب خطۂ وطن مغربی پنجاب چھڑوا دیا۔ اس سانحے نے آزاد کی شاعری میں ایک نئی کسک اور نیا چٹیلا پن پیدا کر دیا ہے۔ چھوٹے ہوئے وطن کی محبّت نے اُن کی معصوم و پُر خلوص ہنسی میں آنسوؤں کی چاشنی اور اُن کے آنسوؤں میں تبسّم کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ اس سے اُن کا کلام اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ دِلّی اُجڑنے کے بعد جو شعرائے دِلّی لکھنؤ آ بسے تھے یا لکھنؤ اُجڑنے کے بعد جن شاعروں کو رامپور و حیدرآباد کا مُنہ دیکھنا پڑا، اُن کے کلام میں اپنی جنم بھوم کے لئے اتنے چٹیلے اشعار نہیں ملتے جتنے آزاد کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس خلوص سے آزاد نے نئے اور اجنبی ماحول کو اپنایا ہے وہ بھی قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔

ایک آدھ بات اور کہہ لینے دیجئے۔ آزاد کے تخیّل اور فن اور اُن کی ذہنی نشو و نما کو سیراب و شاداب کرنے والے ایک طرف بلند ترین مغربی ادب اور علوم ہیں اور دوسری طرف رچے ہوئے فارسی ادب اور اُردو ادب کے کارنامے ہیں علم و ادب کی

دُنیا کے وہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ اُن کی شاعری کی جڑیں گہری ہیں۔ اُٹھان نہایت شاندار ہے اور اس کی تکمیل اور بھی زیادہ شاندار ہو گی۔ یہ شاعری کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے، ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پُکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے شعر کہنا آتا ہے۔

الہ آباد
۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء

جگن ناتھ آزاد

اشرف قادری

جگن ناتھ آزاد کی آواز کئی بار ریڈیو پر سُننے کا اتفاق ہُوا تھا مگر تمام کوششوں کے باوجود اُن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا تھا۔ مجھے اُن سے ملنے کی بے حد خواہش تھی۔ ۱۹۵۰ء میں حلقۂ ادب بہار کا دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہُوا اور خوش قسمتی سے اس کی صدارت کے لئے جگن ناتھ آزاد ہی منتخب ہوئے۔ اس انتخاب سے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔

اجلاس کے دن آزاد صاحب کی مہمان نوازی کی خدمت میرے سپرد کی گئی اور میں نے نہایت خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا، اور فوراً اُس ہوٹل کی جانب بھاگا جہاں وہ مقیم تھے۔ اُن سے ملنے کا تصوّر دل و دماغ پر طاری تھا اس لئے یہ خیال جاتا رہا کہ ہیں کم سے کم اُن کی شکل و شباہت کے متعلق کچھ پوچھ تو لیتا، مگر کیا کہئے کہ راستے میں یہ بات یاد آئی۔ اب

میں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور ہوٹل کی طرف برابر بڑھتا ہی رہا۔

ہوٹل آگیا۔ میں اپنے دل میں ایک ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ بہرصورت تصوّر میں اُن کی تصویر ہزار انداز سے کھینچتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوگیا اور سیدھا منیجر کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں منیجر کے کمرے تک پہنچ بھی نہ سکا تھا کہ ایک صاحب نے میری طرف رُخ کرتے ہوئے "آداب عرض" کہا۔ میرے جواب کے ساتھ ہی اُنھوں نے فرمایا "آپ حلقۂ ادب کی جانب سے تشریف لائے ہیں؟" میں حیران تھا کہ انھوں نے کیسے جان لیا۔ پھر خیال آیا کہ حلقۂ ادب کا نشان میرے شانے پر موجود ہے، جواب کے طور پر میں نے کہا۔ "جی ہاں۔" اُن کے لب و لہجہ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں آزاد صاحب سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اور میرا خیال صحیح نکلا۔ ایک لمبا چوڑا انسان میرے سامنے موجود تھا۔ تھوڑی دیر کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوگیا کہ آزاد صاحب اخلاقیات کا ایک مرقّع ہیں اور خلوص و سادگی کا ایک مجسّمہ۔ دو روز تک اُن کا ساتھ رہا۔ اس دوران میں میں اُن کی سادگی اور خلوص کا قائل ہوگیا اور بے حد معترف!

حلقۂ ادب بتیا کا تیسرا سالانہ اجلاس و مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ اس لئے میں نے اُن سے اس کا ذکر کیا اور شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے بغیر کسی قیل و قال کے گرمی کے صبر آزما زمانے میں طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے بتیا کے اجلاس میں شرکت کرنے

کا وعدہ کیا۔ آپ ہی اس جلسے کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنی پُر مغز تقریر اور بلند پایہ کلام سے سامعین کو سرفراز فرمایا۔ آج بھی اُن کا کلام اس فضا میں گونجتا ہے اور ایک عجیب چاشنی پیدا کرتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا وطن پنجاب ہے جس کو آج کل مغربی پنجاب کہتے ہیں۔ مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے اُس پار عیسیٰ خیل نامی ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کی صبح کو انھوں نے آنکھ کھولی۔ چار پانچ سال کی عمر میں ان کے والد بزرگوار جناب تلوک چند محروم کا جو عیسیٰ خیل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، کا تبادلہ کلور کوٹ ہو گیا۔ اسی وجہ سے آزاد صاحب کو اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کلور کوٹ آنا پڑا۔ کلور کوٹ سے انہوں نے آٹھویں درجے کا امتحان بارہ سال کی عمر میں پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے میانوالی میں میٹرک کی سند حاصل کی۔ اور پھر اس شہر کو خیرباد کہہ کر راولپنڈی گارڈن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخلہ لیا۔ جہاں سے آپ نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ راولپنڈی میں بی۔اے کے بعد تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ آپ وہاں سے لاہور آ گئے اور وہاں اورینٹل کالج سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اس سوچ میں رہے کہ آخر کون سا ایسا کام انجام دیا جائے جس سے قوم و ملک کا فائدہ ہو سکے اور سب سے زیادہ انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ ابھی اسی سوچ بچار میں تھے کہ سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم

پنجاب نے تحریکِ رفاقت کی بنیاد ڈالی۔ یہ تحریک جگن ناتھ آزاد کے مزاج کے بالکل مطابق تھی۔ اس لئے وہ اس تحریک میں شامل ہو کر پنجاب کے گوشے گوشے میں دورہ کرتے رہے۔ انہوں نے تحریکِ رفاقت کی جانب سے ہندو مسلم اتحاد کا کام شروع کر دیا۔ جس زمانے میں انہوں نے اس کام کو انجام دینا شروع کیا، وہ دور فرقہ وارانہ کشیدگی کا تھا، اس لئے یہ تحریک بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کا مقابلہ نہ کر سکی اور آخر کار اس تحریک نے کارکنوں کے عزم و استقلال، جوش و خروش، رواداری اور خلوصِ نیت کے باوجود فرقہ پرستی کی تاریک اور مسموم فضا میں دم توڑ دیا۔ آزاد صاحب نے اب پنجاب کے ایک کانگریسی اخبار "جے ہند" سے وابستگی حاصل کی اور ۱۹۴۷ء تک اس کام کو انجام دیتے رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد آپ کو مجبوراً دہلی آنا پڑا۔ دہلی آنے کے بعد آپ نے چند ماہ تک منسٹری آف لیبر میں کام کیا اس کے بعد منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ سے وابستہ ہو کر "آج کل" اردو ماہنامہ دہلی کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ ابھی تک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔[1]

ہندوستان اور پاکستان کا کون ایسا شخص ہے جو اُن کا نام نہیں جانتا اور ان کے حسنِ سلوک کا دل دادہ نہیں۔ آزاد صاحب کو اُن کے والد بزرگوار نے ابتدائی تعلیم خود دی بلکہ بی، اے کی تعلیم تک اپنے ہی سائے میں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ میانوالی سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے آزاد صاحب نے جب ۱۹۳۳ء میں گارڈن کالج راولپنڈی میں

---

[1] اس وقت آپ اسی منسٹری میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں (ع۔س مسلم)

داخلہ لیا تو ان کے والد بزرگوار جناب تلوک چند محروم نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ بھی راولپنڈی ہی کرا لیا۔

(شاعری کا ذوق)

جگن ناتھ آزاد ایک پیدائشی شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک بلند پایہ شاعر کے گھر میں جنم لیا اور ان کی آغوشِ شفقت میں آج تک پرورش پاتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے والد بزرگوار کی بے حد خواہش تھی کہ آزاد ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہو ادھر آزاد صاحب نے ابتدا ہی سے شاعرانہ طبیعت پائی اور لڑکپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ آزاد بتاتے ہیں کہ سب سے پہلا مصرعہ میں نے پانچ برس کی عمر میں کہا تھا۔ یہ پہلا مصرع کہنے کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ اسی ملاقات کے دوران انھوں نے مجھے بتایا۔ کہ "چار پانچ سال کی عمر میں عیسیٰ خیل شہر مجھے چھوڑنا پڑا مگر اُس وقت کے بعض نقوش یادوں کے شبستان میں اس طرح جگمگا رہے ہیں گویا ابھی کل ہی کی بات ہے۔" اور اِس سلسلے میں دو ایک واقعات مجھے سنائے تھے۔ اوّل یہ کہ عیسیٰ خیل شہر میں رہنے کے دوران میں ایک مرتبہ اُن کے والدِ محترم نے دیوانِ غالب کھول کر اُن کے سامنے رکھا اور مندرجہ ذیل غزل پڑھنے کو کہا۔

"کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی"

اور آزاد نے یہ غزل پڑھ دی۔ اس پر مرحوم صاحب نے فرمایا کہ جگن! اب تم پاس ہو گئے ہو۔" اصرار کرنے پر اُن کے والد نے بتایا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم صحیح اور موزوں پڑھ سکتے ہو یا نہیں۔ تم نے بالکل صحیح غزل سُنائی ہے — اور دوسرا واقعہ یوں بتاتے تھے کہ والد کے عیسیٰ خیل سے تبادلے کے بعد کلورکوٹ جانے کے لئے کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ ہماری کشتی روانہ ہی ہوئی تھی کہ پہاڑ پر بنے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر والد نے ایک مصرع پڑھا "پہاڑوں کے اُوپر بنے ہیں مکان" اور مجھ سے دوسرا مصرع لگانے کو کہا۔ میں نے فوراً کہا "عجب اُن کی صورت عجب اُن کی شان . . ."

گویا آزاد صاحب کی طبیعت لڑکپن ہی سے موزوں اور شاعرانہ تھی۔ سات آٹھ برس کی عمر میں جب آپ کلورکوٹ میں مقیم تھے، موزوں اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ مگر سچ پوچھئے تو اُن کی شاعری کی ابتدا راولپنڈی ہی سے ہوئی۔

حضرت عبدالحمید عدم اُن کی تعلیم کے زمانے میں راولپنڈی ہی میں رہا کرتے تھے۔ یہ جناب مرحوم کے خصوصی دوستوں میں سے تھے۔ عدم صاحب کا بیشتر وقت مرحوم صاحب کے ساتھ ہی اُن کے گھر پر بسر ہوتا تھا۔ آزاد صاحب کے دل و دماغ میں جو ذوقِ ادب اور شوقِ مطالعہ پیدا ہوا تھا اس کو حضرتِ عدم کی مسلسل صحبت نے پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن یہ آزاد کے کلام کے مطالعے سے

یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کی شاعری عدم کے اسلوبِ سخن سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ آزاد نے اپنے لئے بالکل ہی ایک الگ راستہ اختیار کیا، آزاد نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے اپنی شاعری کو نکھارا اور سنوارا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ تین سال کی مدت میں عدم صاحب اور محروم صاحب کی ملاقاتوں کے ذریعے سے آزاد کو ہندوستان کے شاعرانہ ماحول سے کسی حد تک آگاہی حاصل ہو چکی تھی۔

آزاد ابھی تک ادبی محفلوں سے دور ہی رہتے تھے۔ جناب عبدالعزیز فطرت کے اصرار پر انھوں نے شہر کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنا شروع کیا۔ جنابِ فطرت راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں کی جان تھے ا۔ ان کے ساتھ مل کر آزاد نے ادبی سرگرمیوں میں بڑا حصہ لیا۔ آپ نے اپنے کالج میں بزمِ ادب کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت متعدد ادبی اجلاس منعقد کئے۔ اسی زمانے میں یہ اپنے کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں ان کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ "ادبی دنیا" لاہور اور "زمانہ" کان پور میں کلام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

راولپنڈی کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جب لاہور آئے تو ان کی ادبی پرواز کے لئے کھلی فضائیں میسر آئیں خطۂ مینو سواد لاہور ہمیشہ سے اردو ادب کا مرکز رہا ہے۔ لاہور پہنچنے کے بعد آزاد صاحب نے دیکھا کہ یہاں ہر فرد ایک انجمن ہے اور ہر گوشہ ایک

بساطِ ادب۔ یہاں آکر آپ نے مولانا تاجور نجیب آبادی سے فیض حاصل کیا۔

تاجور صاحب کے متعلق آزاد اپنی طویل نظم "وطن میں اجنبی" میں کہتے ہیں:۔

اے رہنمائے قافلۂ شعرا السلام ۔۔۔ اے زندہ دارِ ولولۂ شعرا السلام
مجھ میں ہے تجھ سے حوصلۂ شعرا السلام ۔۔۔ آساں تجھی سے مرحلۂ شعرا السلام

غنچے کو اک نگاہِ محبت سے پھول کر
آزاد کا سلامِ عقیدت قبول کر

اس کے علاوہ آزاد پر ڈاکٹر اقبال کا بہت اثر ہے۔ اس کا انھوں نے کئی موقعوں پر اعتراف بھی کیا ہے۔ آزاد صاحب نے "مزارِ تاجور پر چند لمحے" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس میں روحِ تاجور کی آواز یہ کہتی ہے کہ

فیض گر تو نے اُٹھایا ہے مرے افکار سے ۔۔۔ دل ترا وابستہ ہے اقبال کے اشعار سے
اے پسر یہ ہے ترے حق میں دعائے تاجور ۔۔۔ فکر ہو تیری مضافِ دہر میں سینہ سپر
تا قیامت دل ترا تاثیر کا مسکن رہے ۔۔۔ ہاتھ میں اقبال کے افکار کا دامن رہے
روشنی اقبال کے افکار کی، اشعار کی ۔۔۔ ہر گھڑی ہو رہنما تیرے دلِ بیدار کی

گلشنِ لاہور کے پھولوں کی اے رنگیں بہار
گلستانِ ہند کی تجھ کو فضا ہو سازگار

شاعری کے دو دور

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کے دو خصوصی دور ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے پہلے اور بعد۔

پہلا دور لاہور میں قیام کا ہے جہاں کا چپّہ چپّہ ادبستان تھا اور جہاں فضا جوہرِ قابل کے لئے ہر اعتبار سے سازگار تھی۔ آزاد صاحب کی اس دور کی شاعری بھرپور اثر رکھتی ہے۔ مضامین کی شوخی و رعنائی، طرزِ ادا کی جدّت اور زبان کی شیرینی سے اس دور کی شاعری بھرپور ہے۔ آزاد کہتے ہیں:۔

تجھے کیا بتاؤں ہمدم کہ قفس میں کیا کشش تھی
یہ بجا مری نظر سے نہ پرے تھا آشیانہ
یہ بجھی بجھی فضائیں یہ گھٹا گھٹا سا عالم
مرے نطق چھیڑ کوئی طرب آفریں ترانہ

قفس کی دل کشی میں تو کمی کوئی نہیں لیکن
نہ آئے گی قفس میں رہ کے یادِ آشیاں کب تک
خزاں آئی گلستاں میں تو ہم سمجھے بہار آئی
نگاہِ شوقِ آخر یہ تری خوش فہمیاں کب تک

علم ہے کیفِ بے ثبات، عشق ہے گرمیٔ حیات
زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں
یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دُور جا سکوں

آزاد صاحب تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کے سیلاب میں بہتے بہاتے لاہور سے دہلی آئے۔ اس دوران میں بے بسی اور پریشانی یقیناً غربت بھی۔ ایک طرف وطن کی محبّت دامنِ دل اپنی طرف کھینچ رہی تھی تو دوسری طرف اجنبی ماحول کا تصوّر سوہانِ رُوح بنا ہُوا تھا۔ ان تمام دِقتوں کے بعد دہلی کی اس اجنبی فضا میں سانس لینے لگے تو قدرے دل و دماغ ٹھکانے لگا مگر اب یہاں شعر و سخن کی مانوس فضا کہاں تھی۔ ہر گھڑی ہنگامی کیفیات اور بے سروسامانیاں پیشِ نظر تھیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس سازگار ماحول نے ان کو اپنا بنا لیا۔ اور پھر یہ اس سے گھُل مل گئے، پھر بھی ان کے دل و دماغ پر اس ہجرت اور پریشانی کا بے حد اثر تھا۔ اس کا ان کی شاعری پر بھی بہت اثر پڑا۔ اب یہاں جذبات کی شورش اور طبیعت کے گداز کی جگہ فکر اور سوجھ بوجھ نے لے لی۔ انسان کی شاعری اُس کے تاثرات کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے اس دَور کی شاعری

میں مفکّرانہ مضامین آ گئے اور طرزِ بیان میں بھی سنجیدگی آ گئی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہجرت کا ہنگامہ پیدا ہو گیا تھا۔ آزاد اس سے متاثّر ہو کر کہتے ہیں ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری
کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری
جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پائے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گذری

اپنے وطن کو یاد کر کے کہتے ہیں

وطن سے دوریِ منزل کا یہ سوال نہیں
وُہ بے وطن ہوں کہ جس کا نہیں ہے کوئی وطن
کنارِ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
وُہ تجھ میں بات کہاں اے دیارِ گنگ و جمن

اس طرح اور بھی کئی غزلیں اور نظمیں ہیں جو صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ حبّ وطن نے ان کو بے قرار کر دیا ہے۔ آزاد کا نیا ماحول سازگار سہی سکون آمیز نہیں ہے۔

ان تمام ہنگاموں کے باوجود آزاد ہر دور میں انسانیت کے علمبردار رہے۔ اس جھنڈے کو پریشانی کے دور میں بھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔ سچ پوچھئے تو آزاد نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، وہ اُن تعصبات سے الگ ایک انسان ہیں محض انسان۔ اسی انسانیت کے پرچم کو بلند کرنے کے لئے وہ کوشاں ہیں۔ محمود جالندھری کہتے ہیں۔ "آزاد نے اپنے ہی نہیں پوری انسانیت کے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ انھوں نے اس دشمن کو آپ ہی نہیں دیکھا اوروں کو بھی دکھایا ہے۔ وہ خود فریب کھانے سے بچے ہیں۔ دوسروں کو بھی اس فریب سے دُور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں"۔ آزاد کے یہ شعر دیکھئے ؎

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر

تُند طوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا

"جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا" (اقبال)

دوسری جگہ فرماتے ہیں

خیال غرقِ آرزو، نگاہ محوِ جستجو — پُکارتی ہے زندگی کہاں ہے تو کہاں ہے، تُو

قریب و دُور ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں چار سُو — یہ اور بات ہے کہ آپ جگمگا رہا ہوں میں

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں　　منزل کہاں یہ حسنِ سرِ رہگذر کہاں

نہ پُوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ

ہُوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گذری

آزاد واقعی اسم بامسمّیٰ ہیں۔ وہ ایک بہادر اور دلیر انسان کی طرح اظہارِ حقیقت سے کبھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر حق بات کہہ جاتے ہیں۔ "بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے انھوں نے جو نظم کہی ہے اس کے دو تین بند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اس دور میں تو کیوں ہے پریشاں و ہراساں　　کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں

دانش کدۂ دہر کی اے شمعِ فروزاں　　اے مطلعِ تہذیب کے خورشیدِ درخشاں

حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں

ہر ذرّۂ دہلی ہے تری ضو سے منوّر　　پنجاب کی مستی اثرِ جذبِ قلندر

گنگوہ کی تقدیس ہے قدوس سراسر　　پٹنے کی زمیں نکہتِ خواجہ سے معطّر

مدراس کی مٹی میں نہاں تاجِ شہیداں

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے
نفرت سے پرے اس کا ہر اک طور ہے پیارے

مذہب پہ تعصّب تو بڑا جور ہے پیارے
عقل و خرد و علم کا یہ دور ہے پیارے

اس دور میں مذہب کی صداقت ہو نمایاں

اسلام تو مہر اور محبت کا بیاں ہے
اخلاص کی روداد مروّت کا بیاں ہے

ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے
اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے

کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں

آزاد غزل، نظم، قطعہ اور رباعی کہتے ہیں اور ہر صنفِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری جو براہِ راست قاری کے دل پر اثر کرتی ہے معاملہ بندی، راز و نیاز خلوص، شکایت زمانہ، اخلاق، خودداری، عشق و محبت، سوز و گداز، آہ و فغاں اور اظہارِ حقیقت سے مملو ہے۔ ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) نے آزاد کے متعلق ایک بار لکھا تھا ”جگن ناتھ آزاد کا کلام غزل، نظم، قطعہ، رباعی ادبیت میں رچا ہوا ہے۔ اس کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، چکبست، حسرت موہانی اور جوش میں وجہِ مشترک ہیں۔ الگ الگ شخصیت اور طرزِ اظہار کے باوجود یہ ایک گداز طبیعت، دردمند دل، حسّاس شخصیت کا کلام ہے، ایک محبت کرنے والے

عالی ظرف دوست کی گفتگو ہے۔ جو بہت سی باتیں چشمِ سخن گو اور جنبشِ ابرو سے کہہ جاتا ہے۔ وہ جسے بلاغت کہا جاتا ہے آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے یعنی دل و دماغ دونوں کا نور ہے۔ اس ہیجانی دور میں صحیح ادبی توازن کو برقرار رکھنا بڑی شخصی عظمت کی نشانی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی۔"

آزاد صاحب کی غزلوں اور نظموں کے چند اشعار دیکھئے ؎

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندیٔ ساحل کیا جانے
جو برق میں ضَو ہے شمع میں لو پارے میں تڑپ کوندے میں لپک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وہ دردِ ترا دل کیا جانے
وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اس راہ کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلزار میں رقصاں دیکھیں گے
اے شاخِ فردمایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے

ظلمات کی ہر ایک موجِ کہن سورج کی کرن بن جائے گی
اے شامِ الم اک روز تجھے ہم صبحِ درخشاں دیکھیں گے

اے رازِ محبت بول ذرا، یہ عقدۂ نازک کھول ذرا
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے

اس وقت جو اپنے فکر میں ہے، اس وقت جو اپنے عزم میں ہے
اس طرح کی اک تصویر تری اے عالمِ امکاں دیکھیں گے

اک بار اگر قفس کی ہوا راس آ گئی — اے خود فریب پھر ہوسِ بال و پر کہاں
مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں — رازِ جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

داغ ہے دل کا کسی روز چمک اٹھے گا — یہ کوئی درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
صدمۂ ہجر ترا ایک قیامت ہے مگر — نہیں احسان کسی کا کہ اٹھا بھی نہ سکوں

آزاد کی شاعری عصرِ حاضر کی آواز ہے۔ ایک دل نشیں آواز۔ ان کے پہلو میں ایک ترقی پسند اور دردمند دل دھڑکتا ہے۔ آزاد کے اسلوبِ سخن کے بارے میں کنہیا لال کپور لکھتے ہیں۔ ”جگن ناتھ آزاد دبستانِ اقبال سے تعلق رکھتے

ہیں۔ اُن کی شاعری میں دعوتِ فکر ہے دعوتِ نشاط نہیں۔ ان کی چند نظمیں بالخصوص "شکستِ تمنا"، "ماتمِ اقبال" اور "بہادر شاہ ظفر کا مزار" شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔"

آزاد جہاں ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہیں وہاں انھوں نے ایک بے پناہ شہرت بھی پائی ہے۔ آزاد کی شخصیت میں بلا کی مجلسی کشش ہے اور پڑھنے کا بھی ایک نرالا طرز ہے جو محفل میں اُن کی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ آپ مشاعروں، ادبی نشستوں اور محفلوں پر چھا جاتے ہیں۔

ہند و پاکستان میں جگن ناتھ آزاد کی شہرت ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے ہے۔ لیکن اُن کے نثری کارنامے بھی کم اہم نہیں۔ ان کی کتاب "جنوبی ہند میں دو ہفتے" اُن معدودے چند ادبی رپورتاژوں میں سے ہے جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ علمی ادبی موضوعات پر آزاد کے مقالات کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں لیکن اُن پر ہر طرح سے بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مثل صادق آتی ہے

تصنیفات

آزاد صاحب کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ بہت سی زیرِ طبع ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو زیرِ ترتیب ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کا پہلا مجموعہ "بیکراں" شائع ہوا اب یہ مجموعہ نایاب ہو چکا ہے۔ عنقریب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گا[۱]۔ دوسرا مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذروں تک" شائع ہو چکا ہے۔ حالِ ہی میں مکتبہ شاہراہ

---

[۱] اب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے (ح۔ س۔ ا)

نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ "وطن میں اجنبی" ایک طویل نظم ہے۔ یہ نظم ان تاثرات کا مجموعہ ہے۔ جو تقسیم ہند کے بعد متعدد بار مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کرنے کے لئے پاکستان جانے سے پیدا ہوئے۔ دو طویل نظمیں "اردو" اور "اجنتا کے غاروں میں" الگ الگ کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا چوتھا مجموعۂ کلام "جاوداں" زیر طبع ہے۔ نثر میں "جنوبی ہند میں دو ہفتے" کے نام سے ایک طویل رپورتاژ اور "پٹنے کی ایک رات" چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ دو سفرنامے "مشرقی بنگال میں چند روز" اور "باہمال سے اجنتا تک" زیر طبع ہیں۔ نثر کا ایک مجموعہ "نشانِ منزل" کے عنوان سے زیرِ ترتیب ہے۔ جو مقالات اور ریڈیو سے نشر شدہ تقریروں پر مشتمل ہے۔

جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں۔ "میری مادری زبان پنجابی ہے، لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ صحیح یا غلط اسی میں شعر کہتا ہوں اور اسی کے ذریعے سے اپنا مافی الضمیر پڑھنے والوں اور سننے والوں تک پہنچاتا ہوں۔ اس زبان کو ایک ایسی زبان سمجھتا ہوں جس کی ترقی میں مجھے ہندوستان کی ترقی پنہاں نظر آتی ہے۔ اردو کی قومی روایات کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتا ہوں اور ایک محبِّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے ان پر فخر کرتا ہوں۔"

بتیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء

آزاد کی شاعری

نازش پرتاپگڈھی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ —— "کوئی نامعقول آدمی معقول شعر کیونکر کہہ سکتا ہے" —— صدیقی صاحب کے اس قول کی روشنی میں جب میں جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر نظر ڈالتا ہوں تو قدم قدم پر مجھے آزاد کی نیکی اور شرافت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ آزاد انسانیت کی کن بلندیوں پر ہے اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ واریت کی جو آگ بھڑکی ہے اُس نے اچھے اچھے ذہین اور سمجھ دار انسانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو بزعم خود فرقہ واریت سے بلند اور حقیقی انسانیت کے پرستار تھے۔ آزاد بھی بھڑکتے ہوئے ان شعلوں کے درمیان سے ہو کر گذرا، اُس نے تمام خونیں

مناظر دیکھے اور سُنے — اور — آزاد کو آوارۂ وطن ہونا پڑا۔ لیکن آپ آزاد کا سارا کلام دیکھ جائیے کہیں بھی اُس کا دامن دوسرے فرقے سے نفرت، تعصّب اور بغض و عناد کی گندگی سے ملوّث نہیں ہونے پایا۔ آزاد کے یہاں شخصی کردار کی یہ بلند مقامی محض اس لئے نہیں کہ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے بلکہ اس کا سبب وہ تربیت ہے جو بزرگوں کی نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ بقول فراق گورکھپوری "منشی تلوک چند محروم جتنے اچھے اور پختہ کار شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے اور قابلِ احترام انسان بھی ہیں۔" چنانچہ آزاد کی تربیت میں مشرقی اور مغربی علوم اور تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ حضرت محروم کے کردار کی سنجیدگی اور بلند انسانیت بھی شامل رہی ہے۔ اور جس شاعر کی زندگی میں نیکی اور شرافت کے جوہر ہوتے ہیں، انسانیت اور خلوص ہوتا ہے اُس کی شاعری کو محض شاعری سمجھ لینا خود اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔

آزاد بالکل نیا ہوتے ہوئے بھی قطعی نیا نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ماضی اور اُس کی حسین روایات کا باغی نہیں۔ نام نہاد ترقّی پسندی کے زعم میں اُس کے یہاں گُم راہی اور بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ آزاد نے قدیم اُردو فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور پھر جدید ادبی رجحانات کو بھی اُس نے سمجھنے کی طرح سمجھا ہے۔ اُس کو کلاسیکی ادب کی عظمتوں کا بھی اعتراف ہے اور وہ ترقّی پسندی کی بلندیوں کا بھی قائل

ہے۔ آزاد نے اپنے فن کو سجانے اور سنوارنے کے لئے اگر ایک طرف کلاسیکل ادب کی حُسن آفرینیوں اور نزاکتوں کو ہضم کیا ہے تو دوسری طرف ترقّی پسندی کے تابناک اور جاوید عناصر کو بھی تحلیل کیا ہے۔ اور شعلۂ و شبنم کے اس حسین امتزاج نے آزاد کی شاعری میں وہ سنجیدہ اور بلند توازن پیدا کر دیا ہے جو نئے شعراء میں تقریباً مفقود ہے۔ اسی طرح آزاد کے لب و لہجہ کی جڑیں اگر ایک طرف قدیم ادب کی نزاکتوں اور نرمیوں کی گہرائیوں میں اُتر گئی ہیں تو دوسری طرف جدید ادب کی تلخیوں اور طنز کے دلوں میں بھی دُور تک چلی گئی ہیں اور اس طرح اس کی آواز میں بیک وقت تلخی اور حلاوت پائی جاتی ہے اور سنجیدگی اور جھنجھلاہٹ کا امتزاج ملتا ہے۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ آزاد کی آواز کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہونے پائی اور پھر اس کے زبان و بیان میں بھی شستگی، شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔

کلاسیکی ادب سے گہرے تعلّق کی بنا پر آزاد کا جوہر اس کی غزلوں میں کافی نکھرا ہے۔ اُردو کی غزل گوئی اپنے انحطاطی دَور سے گزر کر نئی زندگی اور نئی قدریں پا چکی ہے۔ آج کی غزل گوئی میں متعدد نئے نئے زاویے اور گوشے اُبھر آئے ہیں اور آج کے غزل گو کے گرد و پیش نئے موضوع، نئی زندگی، نئے خیالات، نئی امنگیں اور نئے نئے جذبات انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ آج غزل گوئی ذاتی اور محدود سی صنف نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ

اس نے اپنے مزاج کی لچک کے سہارے اپنے اندر عالمگیریت آفاقیت اور لامحدودیت پیدا کر لی ہے اور آج کی دُنیا کے تقریباً سارے کے سارے تقاضے اور موضوعات غزل کے دامن میں نظر آتے ہیں اور جگن ناتھ آزاد کی غزلیں بھی ان تمام خصوصیات سے بھرپور ہیں۔ آزاد کی شاعری نے اُس وقت آنکھیں کھولیں۔ جب زمانہ بدل رہا تھا، ادبی قدریں بدل رہی تھیں موضوعات بدل رہے تھے اور زندگی کے نئے نئے تقاضے اُبھر رہے تھے۔ اور پھر آزاد تو شروع ہی سے پُرخلوص، نیک اور انسان اور انسانیت کا پرستار رہا ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اُس کی شاعری اپنے ماحول اور نئی دنیا میں پیدا ہونے والے حقائق سے الگ رہتی۔

آزاد کی غزلوں میں ہمیں اُس زندگی کے نقوش، غیرفانی نقوش نظر آتے ہیں جو کہیں دُور آسمانوں میں نہیں بلکہ زمین پر پرورش پاتی ہے اور رینگ رینگ کر آگے بڑھتی ہے۔ زبان اور بیان کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ آزاد کی غزلوں میں تاثرات کے واضح نقوش اور سچے جذبات کی گہری پرچھائیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور انہیں چیزوں کی بنا پر آزاد کے اسلوب میں بڑی حد تک انفرادیت آچلی ہے۔

اے دوست تری یاد نے بخشا وہ سہارا ہر تلخیٔ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے معلوم نہیں رُخ کو یہ کس نے پکارا

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گذری

تری جستجو میں مری آرزو نے بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے

باوجودیکہ ان اشعار پر ماحول اور دور کی پرچھائیاں زیادہ گہری نہیں ہیں پھر بھی ان کے لب و لہجہ میں قوّت ہے، ان تاثرّات میں گہرائیاں ہیں اور ان احساسات میں شگفتگی ہے اور اس دور کی تمام غزلوں میں تاثرّات کی گہرائیاں اور احساس کی شدّت پائی جاتی ہے۔ آزاد کسی رو میں نہیں بلکہ سوچ بچار کر کہنے کا عادی ہے اس لئے اس کے یہاں کافی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہُوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسّم کا جواب پھول کھِل کر بھی حریفِ رُخِ جاناں نہ ہُوا

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

ہاں حریفِ قہقہہ آہِ سرد ہی سہی
لب تو خندہ ریز ہیں دل میں درد ہی سہی

پاؤں تھک گئے تو کیا آرزو میں دم تو ہے
آنکھ میں چمک تو ہے رُخ پہ گرد ہی سہی

تلاش اور جستجو کی یہ تڑپ اور زندگی کے لئے اس قدر سوا گت حیاتِ انسانی کی دوامی قدروں میں شمار کی جاتی ہے اور آزاد زندگی کی عظمتوں کا یہاں تک قائل ہے کہ:

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

یوں تو آزاد کی غزلوں کا پس منظر نہایت سنجیدہ، متین اور بڑی حد تک خاموش رہتا ہے۔ لیکن جب اُس کے احساس کی شدّت انتہائی تیز ہو جاتی ہے اور جب اُس کے جذبات کسی طرح بھی روکے نہیں رُکتے تو کہیں کہیں اُس کی متانت اور زندگی کا ستون لرز بھی جاتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ لرزش نمایاں ہو اور

تاہم اُس پر تیشے کا الزام لگا سکیں۔

خزاں کے تند بگولو ذرا ٹھہر جانا
چمن کے ساتھ نہ لٹ جائے آبروئے چمن

نصیب سبزۂ خوابیدہ کا نہ جاگ سکا
چمک چمک کے فسردہ بھی ہو گئی ہے کرن

دلِ ناداں یہاں خاموش رہنا
نہ ہو جائے مزاجِ دوست برہم

ترا کرم ہے بادِ بہاراں
ہر شاخ زخمی، ہر پھول بسمل

تجلی تو گردوں پہ چمکی ہے لیکن
تجھے واقعی کیا یقیں سحر ہے

فصلِ گل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی
آہ وہ شوقِ فسردہ کہ غزلخواں نہ ہوا

وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گزری

ان تمام اشعار میں اُس کے احساس کی گہرائی اور لہجے کی توانائی کے ساتھ

مشاہدات، خلوص اور تدبّر کی ہمہ گیری نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

آزاد کے تغزّل کا رنگ دل نشیں اور روح گیر قسم کا ہے جس میں متانت اور بصیرت کی فراوانی پائی جاتی ہے، اُس کی غزل میں انتہائی پختگی سوز، گھلاوٹ، ہمک اور لطافت پائی جاتی ہے اور پھر یہ کہ اُس کے واردات اور احساسات سچّے ہیں۔ جذبات میں گہرائی اور خلوص ہے اور خیالات میں ندرت اور نفاست ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آزاد کے لب و لہجہ میں یکسانیت اور توازن ہے اور اپنائیت اور کسک ہے جو دلوں میں اُتر جاتی ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو آزاد کی غزلوں کو آفاقیت کی سرحدوں کے قریب لے جاتی ہیں۔ آج کا ادب عجیب بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ تقریباً ہر فن کار پر غم و غصّہ اور جھلاہٹ طاری ہے۔ لیکن جب ہم آزاد کی غزلوں پر نظریں ڈالتے ہیں تو وہاں ہم کو غم کا احساس نہیں ملتا، ماحول کی گرانباری سے تھکن نہیں نظر آتی اور اضمحلال اور تشویش کے سائے تک نہیں پائے جاتے اس لئے کہ آزاد اپنے ماحول سے، آدمی سے، اور انسانیت سے کسی سے بھی مایوس نہیں۔ اُس کے یہاں اُبھرنے اور پھیل جانے کی طاقت و اُمنگیں اُبھرتی ہوئی ملتی ہیں اور اُس کے فن کی رگوں میں خونِ نمو دوڑ رہا ہے۔

منظر کی حد تک لگا دیا ہے سیاہ راتوں نے شامیانہ

اسی اندھیرے میں دیکھتا ہوں اُبھر رہا ہے نیا زمانہ

سیاہ خانوں میں رہنے والو نظر اُٹھاؤ، اُفق پہ دیکھو

وہ اک کرن توتلی زباں سے سنا رہی ہے نیا فسانہ

ہمّت نہ ہارو اے جاں سپارو! وہ آئی منزل وہ آئی منزل

ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں اے چاند تارو! اے چاند تارو

میرے رفیقو! وقت آگیا ہے بزمِ جہاں کا چہرہ نکھارو

عزم و ہمّت کے کرشمے ہیں یہ اے اہلِ چمن عزم ہو دل میں تو یہ دورِ خزاں کچھ بھی نہیں

آزاد کی غزلوں میں اس قسم کے چونکا دینے اور جھنجھوڑ دینے والے اشعار کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اُس کے فن پر عزم اور اعتماد کی تہیں گہری پڑتی جا رہی ہے اور اب اس کی سادگی اور خلوص میں عوام کے دلوں کو ہم آہنگ کر لینے کی طاقت رچتی اور سجتی

جا رہی ہے۔ آزاد کے محسوسات میں لطافت اور خیالات میں فرد افسردہ زیاں آتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ اُس کی غزلوں میں صالح اور صحت مند خون کی گردش تیز تر ہو چکی ہے اور وہ دن دُور نہیں جب آزاد کا شمار غزل گو شعراء کی صفِ اوّل میں کیا جائے گا۔

دوسرے تمام شعراء کی طرح آزاد کی شروع کی نظمیں بھی ذکرِ محبّت سے بھرپُور ہیں۔ لیکن اس کے رومان میں نہ تو کہیں فراریت نظر آتی ہے اور نہ ابتذال اور پستی، بلکہ اس کے یہاں صحت مند اور ترقّی یافتہ رومان کے تابناک جوہر ملتے ہیں — اور پھر دوسرے ذہین فن کاروں کی طرح آزاد بھی عشق و محبّت کی وادیوں سے بہت جلد نکل آیا، اس لئے کہ اس کی محبّت کا دائرہ شروع ہی سے بے حد وسیع رہا ہے۔ اُسے دُنیا بھر کے انسانوں سے محبّت اور پیار ہے۔ پھر وہ کسی ایک فرد کی اُلفت اور محبت کو اپنی شاعری کا مرکز کس طرح بنا سکتا تھا اور اب اُس کے فن کا محور ذاتی اور شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہے، جہاں وہ سچّی اخوّت، حقیقی مساوات اور ہمہ گیر محبّت کی تلاش میں ہے۔ آزاد کی اس تلاش و جستجو میں کسی مخصوص جماعت کے اثرات کار فرما نہیں ہیں بلکہ وہ نفسِ انسان اور انسانیت کی عظمتوں کا قائل ہے اور محبت کی ہمہ گیریت کا معترف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے نظم پر پروپا گنڈے اور کھوکھلے نعرے بازی کی پرچھائیاں تک نہیں پڑنے پاتیں بلکہ اس کی سیاسی نظموں میں حسین اور شاعرانہ اندازِ بیان ملتا ہے

آزاد نے اپنی شاعری سے رومان پرستی کو زبردستی خارج نہیں کیا اور نہ وہ فیشن اور رواج کے زیرِ تحت سیاسی نظمیں کہتا ہے بلکہ اس نے انتہائی ذمہ داری کے ساتھ اپنے ماحول اور گردوپیش بکھرے ہوئے حالات اور واقعات کا جائزہ لیا ہے اور اُن کی گہرائیوں میں دُور تک اُتر گیا ہے۔ اُس نے لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی قدروں کی نبض پر اپنی اُنگلیاں رکھ دی ہیں اور اُس نے حیاتِ انسانی کے نَو بہ نَو تقاضوں اور مانگوں کا خورد بینی مطالعہ کیا ہے اور پھر ان تمام چیزوں کو آزاد نے ویسے ہی نہیں پیش کر دیا بلکہ اس نے انہیں چبایا ہے، تحلیل کیا ہے اور ہضم کیا ہے اور پھر نہایت لطیف شگفتہ اور شاعرانہ انداز میں اپنی سیاسی نظمیں تخلیق کی ہیں جنھیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا سیاسی شعور کافی بالغ اور پختہ ہے، اُس کی نظر دُور رس اور گہری ہے اور اس کے دل میں انسانیت کے لئے کس قدر خلوص، کس قدر درد اور کس قدر محبّت پائی جاتی ہے۔

آزاد نے بحر و قوافی اور دوسری فنّی پابندیوں سے عمداً بغاوت کہیں بھی نہیں کی۔ وُہ شاعری میں ردیف اور قوافی کے حسُن اور ترنّم کا قائل ہے البتہ موضوع اور اندازِ بیان میں اجتہاد آزاد کے یہاں جا بجا پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے ذاتی احساسات، مشاہدات اور تجربات کے سہارے کہتا ہے

اس لئے اس کے کلام میں اُلجھاؤ اور ابہام کہیں بھی نہیں آتے۔

ہٹو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری

نو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
نو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے
آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سو نگراں آج بھی ہے
آج بھی مفت منظر ہے وہی سینوں کا عناد
بندا اخلاص و محبت کی دُکاں آج بھی ہے

آج بھی غیر کی تعمیر کے کام آتی ہے
وائے برخستگیٔ خاکِ پریشانِ وطن
ان کے دل پر تجھے معلوم بھی ہے کیا گزرے
ایک پل کو بھی جو لوٹ آئیں شہیدانِ وطن

کس لغت میں ہے یہ مفہومِ مساوات کہ ہوں
میرے دامن میں خزف اور کے دامن میں گُہر
جا بجا آبِ مصفا کے رواں ہوں چشمے
اور قطروں کو ترستی رہے انساں کی نظر

اِدھر صیّاد پھرتے تھے اُدھر صیاد پھرتے تھے
کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی

اِدھر بھی آگ بھڑکی تھی اُدھر بھی آگ بھڑکی تھی
زمینِ باغ پہ یوں رحمتِ پروردگار آئی

تمام تر تلخ حقیقتوں کو بیان کرتے ہوئے بھی آزاد کے یہاں تلخ نوائی نہیں پائی جاتی اُس کے لب و لہجہ میں تندی نہیں آتی اور وہ جذبات کی شدّت میں بہہ نہیں جاتا بلکہ اپنے غم و غصّہ پر حیرت انگیز طور پر قابو رکھتا ہے ۔ اپنے جذبات میں اعتدال اور توازن قائم رکھتا ہے اور خود ضبطی کا یہی وہ تابناک جوہر ہے جو آزاد کے یہاں بھڑکتے ہوئے شعلوں اور لپکتی ہوئی چنگاریوں کو تخریب کے بجائے تعمیر کی جانب متوجہ کر دیتا ہے اور پھر آزاد کا کلام مستقبل آفریں تصوّرات سے جگمگانے لگتا ہے ۔

وقت کی تندئ سیلاب نہ چھوڑے گی اُسے
آج جو وقت کے سیلاب سے ٹکرائے گا

یہ شقاوت کا زمانہ نہ رہے گا باقی
اور خوش بختئ افراد کا وقت آئے گا

عالمِ پاک میں فردوس کوئی ہے تو اُسے
خاک اور خاک کی تقدیر پہ رشک آئے گا

آزاد کے پاس اُس کے شخصی کردار میں خود ضبطی کا ساحل ایسا ہے جو غم و غصّہ اور شدّتِ جذبات کی بے پناہ اور خوفناک لہروں کو آگے بڑھنے سے روک لیتا ہے اُن میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح آزاد اور آزاد کا فن دونوں

ہی یاس اور قنوطیت کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد اپنے غم و غصہ پر قابو رکھتا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی نہج سے کمزور پاتا ہے یا عفریتِ وقت کے پنجے مروڑ دینے کی قوّت نہیں رکھتا۔ بلکہ یوں ہے کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو سطحیت اور گھٹیا ادب سے بلند کر لیتا ہے۔ آزاد عہدِ حاضر کی وحشت اور بربریت کا دشمن ہے۔ لیکن شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے اس دشمن پر بغیر سوچے سمجھے اُلٹے وار نہیں کرتا وہ معرکہ کے ہر پہلو پر غور و فکر کرتا ہے اور پھر بہت سوچ سمجھ کر اپنا قدم بڑھاتا ہے۔

عزم کے ہاتھ میں شمشیرِ شجاعت دے کر — جہدِ ہستی میں اُسے مائلِ پیکار کریں

روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدّت سے — ذہنِ انسان کو اب اس دور میں بیدار کریں

یا پھر اس کی نظم ــــ ”ذرّو! قطرو!“ ــــ

بے سود و کمزور نہ جانو، اپنی ہستی کو پہچانو

ذرّو!

اپنے سوزِ دروں سے چمکو اور خورشید بنو

قطرو!

اپنے عزمِ جواں سے مچلو اور طوفان بنو

ذرّو قطرو!
ایک نئے مضمون کی اب تمہید بنو
ذرّو قطرو!
ایک نئی محفل کا اب سامان بنو

احساس کی تلخی اور ولولوں کی شدّت پورے اُٹھان پر ہے اور یہ مقام وہ ہے جہاں آزاد جیسا متوازن اور سنجیدہ مزاج رکھنے والا انسان بھی ذہن میں دبی دبائی چنگاریوں کو سُلگنے سے باز نہ رکھ سکا۔

سردار، مخدوم اور ساحر کی طرح آزاد کے یہاں بھی عہدِ حاضر کے اضطراب اور قیامت زائیوں کی ان گنت تصویریں اور مرقعے ملتے ہیں اور اس کے شاعرانہ شعور کا سیاسی اور سماجی پس منظر بھی تقریباً وہی ہے جو دوسرے تمام ترقی پسند شعراء کا ہے۔ آزاد نے بھی طبقاتی کش مکش کا مطالعہ بہت گہرا اور بہت ہی قریب سے کیا ہے اور اُسے بھی عوامی شاعروں کی صف میں ممتاز جگہ دی جا سکتی ہے لیکن دوسروں کے خلاف آزاد کے یہاں عمومیت اور سستاپن نہیں ہے جھنجھلاہٹ اور جھلاّہٹ نہیں ہے، ظاہری گونج اور گرج رکھنے والی کھوکھلی اور بغیر مغز کی باتیں نہیں ہیں اور ہنگامی شاعری نہیں ہے بلکہ آزاد کے یہاں ایک بلندی ہے جو بلند ترین ہوتی چلی جا رہی ہے، اُس کی تنقیدِ حیات اپنی تمام تر سادگی کے باوجود پُر خلوص اور بھرپور ہے، کسی مخصوص جماعت

کے اثرات سے دور ہو گئے ہوئے بھی اُس کے یہاں زندگی سے، انسانیت سے اور کائنات سے گہرا لگاؤ ہے اور اس کا اندازِ بیان ابہام سے پاک اور بے حد دل کش ہے جو نازک سا فرق ماحول کی عکاسی اور پروپاگنڈے میں ہوتا ہے وہی فرق جگن ناتھ آزاد اور دوسرے سیاسی شعراء میں ہے اس لئے کہ آزاد اپنے فن کو جذباتیت پر قربان نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسی کو اپنے بے پناہ خلوص اور سادگی کے ساتھ بیان کرتا ہے اور انداز بیان وہ اختیار کرتا ہے کہ اس کے کلام کا تاثر پڑھنے والے کے احساس کے تاروں میں ایک غیر محسوس سی لرزش اور جھنجھناہٹ پیدا کر دیتا ہے اور ہم بہت دیر تک کچھ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

آزادی کی شاعری پر ایک سنبھلے ہوئے انسان کی ذہنیت اور احساسات کی پرچھائیں پڑتی ہیں جس میں زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی جاذبیت نمایاں چیزیں ہیں اُس کی آواز میں یقین اور لہجے میں امید کی روشنی ہے۔

ماحول ہے روشنی لٹانے والا تاریک کرہ ہے جگمگانے والا
جو دورِ نشاط ہے تری نظروں میں وہ دورِ نشاط ہے اب آنے والا

"شاعرؔ" بمبئی
جنوری ۱۹۵۲ء

جگن ناتھ آزاد کی شاعری

کلام حیدری

حالی نے شاعر بننے کے لئے "سب سے اوّل سبق استعداد اور پھر نیچر کا مطالعہ اور اس کے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور اُن کے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا اور اگر میسّر آئے تو اِن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں" ضروری قرار دیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ احساس ہُوا ہے کہ انھیں اساتذہ کے کلام سے غیر معمولی قربت نے فن کی یہ پختگی اور بیان پر قدرت بخشی ہے۔ اور یہ کہ انھیں ایسے لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کے، واقعی بھی میسّر آئے ہیں جنھوں نے ان کی شاعری پر جلا کر کے اُسے خارجی حیثیت سے تابناک اور منوّر کر دیا ہے اور اس کے لئے انھیں بہت دُور نہیں جانا پڑا۔ منشی تلوک چند محروم کے

صاحبزادے ہونے کی وجہ سے ان کی شعری تربیت کتنی مکمل ہوئی ہوگی اس کا اندازہ
مشکل نہیں ہے۔ اپنے والد بزرگوار جیسے نکتہ رس اور صاحب فن شاعر کی تربیت
نے ان کے ذوق کو وہ بلندی عطا کی جس نے آزاد کی شاعری کے لئے ایک اچھے
بیک گراؤنڈ کا کام کیا ہے۔ اس زمین پر آزاد کی انفرادیت نے جو گل بوٹے کھلائے
ہیں وہ دراصل جدید شاعری کے ایسے نمونے ہیں جنھیں نظر انداز کر دینے کی جرأت
نہیں ہو سکتی۔ آزاد نے نئے سفر کے لئے جو نیا چراغ روشن کیا اس کے لئے انھوں
نے روشنی اپنے گھر ہی سے لی۔

جب حضرت محروم نے آزاد کی موزونیٔ طبع کی پرکھ کے لئے اُن کے سامنے دیوانِ غالب
سے یہ غزل پڑھنے کو کہا ؂

کوئی اُمید بر نہیں آتی ـــــ اور دوسری جماعت میں پڑھنے والے آزاد نے
یہ غزل موزوں طریقے پر پڑھ دی تو حضرت محروم نے فرمایا ـــ "تم یقیناً شاعر ہوگے۔"
آزاد نے اس پیشین گوئی کی لاج رکھ لی۔ آزاد نے جب میٹرک پاس کیا تو ان کے
والد بزرگوار کا تبادلہ کلور کوٹ سے راولپنڈی ہو گیا۔ یہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ
تھی۔ شعر و ادب کے اس ماحول میں آزاد کے ذوق کی تسکین بھی ہوئی اور پرورش بھی!
اور کچھ دنوں کے بعد آزاد اس انجمن کے سکریٹری ہو گئے۔ تقریباً دو سال تک

انھوں نے یہ خدمت انجام دی۔ عبدالحمید عدم کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع بھی انھیں یہیں ملا جو اکثر مرحوم صاحب کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ عدم سے متاثر ہوئے مگر تقلید سے دانستہ احتراز کیا۔ جس حد تک ہماری نئی نسل اقبال سے متاثر ہوئی ہے وہ اربابِ ادب پر واضح ہے۔ آزاد بھی اقبال سے متاثر ہوئے اور یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے اقبال کی تقلید کی جس کے وہ معترف ہیں۔ مگر تقلید سے فطرتِ آزاد نے خود بغاوت کی اور شعوری طور پر انھوں نے اپنی اس کمزوری پر فتح پائی۔

بی اے کے بعد انھیں لاہور کا ادبی ماحول ملا جس نے ان کی ترقی کی رفتار کو کچھ اور تیز کر دیا۔ اب لاہور اردو ادب کا ایک مرکز ہو گیا تھا۔ اس مرکز میں رہ کر آزاد کی شاعری کی کرنیں دُور تک پھیل گئیں۔ "ادبِ لطیف" اور "ادبی دنیا" جیسے مقتدر رسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا جس نے بہت جلد اہلِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایم اے کے بعد "وطنیت" کے جذبے نے ہندو مسلم اتحاد کے پُرخلوص جذبے کو جنم دیا۔ اور انھوں نے چند رفقا کے ساتھ پنجاب میں اتحاد کا پرچم بلند کیا۔ مگر یہ وقت وہ تھا جب فرقہ وارانہ سیاست کا زہر حاکم طبقہ نے عوام کی رگوں میں حل کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں پانچ دریاؤں کے دیس سے دُور آزاد دہلی آ گئے۔ سونے کا بنگال تقسیم ہو گیا۔ تقسیمِ ہند۔ آزادی اور فسادات۔ —— یہ سب اس طور

پر ایک ساتھ آئے کہ آزادی، بربادی اور تقسیم —— ان میں سے کوئی بھی چیز صاف نظر نہ آ سکی —— اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ تعصب کی لگائی ہوئی اس آگ میں ہندوستان کا تمام تہذیبی سرمایہ جیسے جل جائے گا۔ آزادی آئی مگر کس روپ میں —— کان بہار کی آمد کے مژدے سُن رہے تھے اور آنکھیں —— یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ آنکھیں اس کے بعد بھی کچھ دیکھنے کو باقی رہ سکیں گی۔ اور یہ کب ختم ہُوا؟ اس وحشت کے دیوتا نے ہم سے اتنی بڑی قربانی لی جس کی تلافی ممکن نہیں —— مہاتما گاندھی کی شہادت اس صدی کی بڑی ٹریجڈی ہے۔ ایسی بہار کی آمد پر جگن ناتھ آزاد کی اس غزل میں کتنا درد، کتنی ٹیسیں سمو دی گئی ہیں۔

نہ پُوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری

اس اندھیرے وقت میں "دیوانوں" کی بات تو خیر کیا تھی فرزانے بھی اپنی فرزانگی سمیت جانے کہاں کھو گئے تھے، گم ہو گئے تھے

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گذری

اس "کیوں" اور "کیا" نے شاعری کا تمام حسن برقرار رکھا ہے۔ اور اس

میں شاعر کی شخصیت ایک" ڈنڈ" بن کر رہ گئی ہے۔

شمعِ آزادی کی لَو نے طویل جد وجہد کے بعد اپنا جلوہ دکھایا مگر

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بے تاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گذری

دَیر و حرم کی اس جنگ سے کیا حاصل ہُوا۔ نہ حرم کی حُرمت باقی رہی اور نہ دَیر کا وقار۔ خدا کا گھر اور صنم خانے دونوں مسمار ہوگئے اور ہماری عظیم تہذیبی روایتوں کی گردن جُھک گئی

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری

اور اپنے گلستاں کی اس بربادی پر آزاد نے کتنے خلوص سے ماتم کیا ہے۔

نشانِ برگِ گُل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گذری
وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گذری

ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کے پیچھے وہ کون سے نظر نہ آنے والے ہاتھ تھے

وہ کون سے ساحر تھے جن کے فسوں میں اتنی آتشیں لپٹیں تھیں کہ ہمیں اپنی زندگی، اپنا ادب، آرٹ، کلچر سب کچھ جھلستے نظر آنے لگے۔ یہ ستم راں کون تھے ان کا کیا ہوگا

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گذری

آزاد وقت کی رفتار پر بڑی محتاط نظریں رکھتے ہیں اِن کے قدم وقت کے ساتھ اُٹھتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے سماجی ہنگاموں سے بے خبر نہیں رہے ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے انھوں نے تمام حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔ انھوں نے فسادات کو ہنگامی چیز سمجھ کر خود کو شیش محل میں چھپا لینے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ قلعہ بندی شکست کی علامت ہے۔ آزاد کی شاعری میں مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ انھیں زندگی سے کترانا نہیں آتا، انھیں زندگی کی پریشان زلفوں کو سلجھانے میں ایک خاص لطف آتا ہے حالانکہ انھیں اس کا بخوبی اندازہ ہے کہ

بہت مشکل ہے دُنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے (مجاز)

پھر بھی ـــــ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ مشکل کام الگ رہنے سے نہیں ہوگا اس لئے

بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل آزاد اٹھو اِن کو سنوارو

وہ "طوفانوں کی باتیں" "آسودۂ ساحل" ہو کر جاننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ طوفانوں میں رہ کر "اندازۂ طوفاں" کرتے ہیں۔ اور

جب عشق ہوا اپنی دُھن میں رواں بے خوف وخطر منزل کی طرف
وہ راہ کی مشکل کیا سمجھے، وہ دُوریٔ منزل کیا جانے

آزاد نے عشق پہ بھروسا کیا ہے۔ اس لئے گیتی کے کاکل کو سنوارنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔

اس انتشار کے دَور میں بھی آزاد کو "ترتیبِ نشیمن" کا خیال رہا۔ اس توڑ پھوڑ اور تخریبی زمانے میں تعمیر کا خیال آزاد کی انفرادیت ہے۔ شاعر اپنے ملک، اپنے عوام اور اپنے دَور کا نمائندہ ہوتا ہے۔ عوام اس دَور میں بھی سوچتے تھے کہ آخر اس کے بعد کیا ہوگا۔ اور یہی خیال آزاد کو بھی ستا رہا تھا

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

تعمیر کا یہ خیال آزاد کو عظمت بخشتا ہے اور انھیں جدید شعراء میں ممتاز درجہ دیتا ہے۔

اس دَورِ بربریت کی عکاسی آزاد کی شاعری میں جا بجا ہے۔ انھوں نے

جس شدت کے ساتھ ان حقائق کو محسوس کیا اتنی ہی شدت سے اُسے پیش کیا ہے اور زیادہ تر شاعری کے حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا جیسا کہ اکثر شعراء نے کیا۔ جذبہ خام مواد ہے ہمارے اکثر شاعروں نے اسی خام مواد کو موزوں کر کے پیش کر دیا۔ جس سے تاثر بھی کم ہوگیا اور فن کے تقاضے بھی پورے نہ ہوئے۔ مگر آزاد کے ہاتھوں نے کچی مٹی سے شاعری کے حسین و جمیل جام و مینا بنائے۔ یہ چیز آزاد نے ریاضِ فن سے حاصل کی ہے جس کے لئے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد کی اسی عرق ریزی نے ان کے اندازِ بیان کو وہ حُسن اور جمال بخشا ہے جس سے شاعری لطیف اور پُراثر ہوتی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ آنے والے فسادات آزاد کی شاعری میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے قبل آزاد کی شاعری کو وہ شعور نصیب نہیں تھا جو اس کے بعد ملا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے پاس جذبات اور شعور کا ایک چھپا ہُوا خزانہ ضرور تھا مگر جس سے آزاد خود ناواقف تھے۔ فسادات نے اس پر سے وہ پردہ اُٹھا دیا جس کے اُٹھتے ہی آزاد کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ——— اور یہیں سے وہ ایک تیسرے قسم کے غم سے دوچار ہوئے۔ جو غمِ جاناں بھی نہیں اور غمِ دوراں بھی نہیں مگر جس کے متعلق آزاد صرف اتنا کہہ سکتے ہیں،۔

"یہ غم ایک عجیب قسم کی بے بسی کا خلاق ہے اور اس بے بسی میں ایک، ایسی کیفیت پنہاں ہے جس کی بدولت یہ غم مجھے غمِ جاناں یا غمِ دوراں سے کم محبوب نہیں۔"

غمِ جاناں سے بھی آگے غمِ دوراں سے بھی آگے
اک ایسا غم بھی ہے الفاظ میں جو آ نہیں سکتا

اسے بے بسی کہیئے، غم کہیئے۔ جو کچھ بھی کہیئے بڑی قیمتی چیز ہے۔ آزاد کی شاعری کی گہرائیوں میں دیکھئے تو آپ کو انڈر کرنٹ کا ایک طوفان نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کے یہاں اوپر کی سطح پر زیادہ ہلچل اور بے تابی نہیں ملتی ہے۔ مگر اس سطح کے نیچے لہریں کتنی بے قرار کتنی بے چین ہیں اس کا اندازہ جلدی نہیں ہو سکتا۔ یہ بے تاب لہریں، یہ خاموش سطح کے نیچے پوشیدہ طوفان ——— یہی آزاد کی شاعری کی روح ہے۔ جہاں تک پہنچنے کے لئے ان تمام تجربات کا سائنسی تجزیہ کرنا پڑے گا جنھوں نے آزاد کی شاعری کو یہ حسن بخشا ہے۔ تجربات کو جب فن کاری کے منازل سے گذرنا پڑتا ہے تو فن کار کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن اور آزمائش کا ہوتا ہے۔ یہ کسی جادو سے نہیں ہوتا کسی غیبی طاقت کی مدد بھی نہیں پہونچتی بلکہ ریاضِ فن کام آتا ہے۔ خود آزاد بھی اسے الہامی شئے تصور نہیں کرتے۔

"شعر کہنے کے لئے میں اب آسمانی برکت کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اب تو جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اُس سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔"

شاعری کو الہامی شے وہی مانتے ہیں جو سماجی علوم سے ناواقف ہوتے ہیں۔ شاعری کی ابتدائی درسی کتابوں میں ہی شعر کی جو تعریف کی گئی ہے اُسے ہی مان لیا جائے تو بھی شعر اُس کلام موزوں کو کہیں گے جو متکلم سے قصداً صادر ہو۔ اس مقصدی شاعری کی طرف آزاد کو ۱۹۴۷ء کا کشت وخون لایا اُن واقعات میں جانے وہ کون سی بات پنہاں تھی کہ ہمیشہ کے لئے اپنے اثرات ان کے ذہن پر چھوڑ گئے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

"مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جذبات وخیالات کے بند چشمے تھے کہ اشارہ پاتے ہی پھوٹ پڑے ہیں۔ ایک برف زار تھا جو مہرِ نیمروز کی حدّت کا محتاج تھا اور جب اُس کی بھرپور کرنوں سے دوچار ہُوا تو ایک سیلاب بن کر بہہ نکلا۔"

ایک طویل نیند کے بعد آزاد کی آنکھیں کھلی تھیں اور کب کھلیں:۔

اِدھر صیّاد پھرتے تھے اُدھر صیّاد پھرتے تھے
کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی
اِدھر بھی آگ بھڑکی تھی اُدھر بھی آگ بھڑکی تھی
زمینِ باغ پر یوں رحمتِ پروردگار آئی

اور ان کھُلی آنکھوں نے کیا دیکھا؟

اسی ہندوستاں میں دھرم کی، مذہب کی دُنیا میں
تمدّن کو جنوں کی لہر میں بہتا ہُوا دیکھا
معین الدّین چشتی کی زمیں پر کرشن کے گھر میں
مسرت کو الم کی داستاں کہتا ہوا دیکھا

آزاد کی شاعری کا ایک روشن پہلو ان کی رجائیت ہے۔ وہ مایوس ترین لمحات میں بھی قنوطیت کے ہاتھوں مفلوج نہیں ہُوئے۔ انھوں نے زندگی کے سیندور کو ہمیشہ سیاہیوں سے بچائے رکھا۔ تعصّب، نفرت، انتہا، ہی اور بربادی کے اس تیز طوفان میں انھوں نے آس کا دیا اپنا لہو دے کر جلائے رکھا۔ اپنے خونی ماحول پر نظر رکھی۔ اس کی کڑی تنقید کی اور اس یقین کا دامن کبھی نہیں چھوڑا کہ ان سیاہیوں کے پیچھے وہ سورج بھی ہے جو سراسر نُور

ہے۔ وہ سنہرا دور ان کی دُور بین نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہو پایا۔ جب انسان اپنی عظمت کو پالے گا۔ اور جب سرمایہ و محنت کا یہ تضاد، نسلی برتری اور طبقاتی تقسیم کی یہ گھناؤنی روائیتیں مٹ جائیں گی۔ تاریک ترین دَور میں ان کی رجائیت روشن مستقبل کی جانب واضح اشارہ کرتی ہے۔ انھوں نے منفی طور پر کبھی نہیں سوچا۔ یہ اُن کی شاعری کی ایسی خصوصیت ہے جو انھیں ممتاز بناتی ہے۔ "آج" کا بھیانک روپ ضرور نظروں کے سامنے ہے مگر اس میں سہانا "کل" نہیں چھپ جاتا۔

نوبہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو — نوبہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے
آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد — دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے
آج بھی دل میں ہیں بے تابِ تکلّم نالے — اور سینے میں دلِ زار طپاں آج بھی ہے
جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں — عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

"نوبہاروں" کی یہ تصویر کتنی بھیانک اور کتنی تکلیف دہ ہے۔ خون میں نہائے ہوئے "آج" کی کتنی مکمّل تصویر ہے۔ کون کہہ سکتا ہے اس "آج" کے بعد کوئی ایسا "کل" بھی آئے گا جب عشق کی آنکھ نم نہ دیکھی جائے گی، حُسن جلوہ فرمائی سے گریز نہیں کرے گا۔ مگر زندگی ساکت و جامد تو نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ آگے بڑھتی ہے، ترقی کرتی ہے۔ اس شاخ سے ٹوٹتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر کوئی اگر یہ سمجھ لے کہ زندگی فانی ہے اور اس

کا اعتبار نہیں تو یہ فلسفہ ہماری قوتِ عمل کو مفلوج کر دے گا۔ اس سے ہمارے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس شاخ سے ٹوٹتے ہوئے گلوں کے ساتھ ان گلوں پر نظر رکھنی چاہیئے جو پھوٹ رہے ہیں۔ زندگی کے تسلسل اور اس کے ارتقا پر نگاہ نہ ہو تو یہ زندگی کا ادھورا تصوّر ہے۔ زندگی کا یہی تسلسل ہے جو سماج کو آگے بڑھاتا ہے۔ آزاد کے سامنے زندگی کی مکمل تصویر ہے وہ ادھورے فلسفے کے ساتھ نہیں ہیں

ایک ہی رنگ دکھایا ہے ابھی تک میں نے
ایک رنگ اور بھی اس پیکرِ تصویر کا ہے

اس رنگ میں ابدی حسن ہے۔ آزاد کی نگاہیں زندگی کے ارتقاء سے کبھی نہیں ہٹتیں۔ اسی لئے کہتے ہیں

گرچہ انساں ہے زبوں حال مگر میں اے دوست
دورِ مستقبلِ انساں سے نہیں ہوں مایوس

انسان کے مستقبل کے مایوس ہو جانے کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے؟ خودکشی اور موت! مگر زندگی کو موت نہیں اس لئے

اب نگاہوں میں ہے اک عالمِ نو کی تعمیر
اب نگاہوں میں تخیّل کے سمن زار نہیں

حالات پر کڑی نگاہ رکھنے والا یہ شاعر، وقت کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے اس تجلّی کو دیکھ رہا ہے جس کی روشنی زمین پر پھیلتی جا رہی ہے، وہ اپنے عہد کے انسان کو دعوتِ نظّارہ دیتا ہے۔ مگر "کچھ" ایسے بھی ہیں جو اس پھیلتے ہوئے نور کو نہیں دیکھ سکتے

کوئی اِس نُور کو دیکھے کہ نہ دیکھے اے دوست — نور والوں کا زمانہ تو نہیں رُک سکتا
لبِ جمہور پہ اس وقت جو ہے رقص کناں — حرّیت کا وہ ترانہ تو نہیں رُک سکتا
بزمِ کہنہ کو ہے اب ایک بہانہ درکار — وہ اُجڑنے کا بہانہ تو نہیں رُک سکتا

"نور والوں" کے زمانہ کی آمد کا یقین کتنا گہرا اور اٹل ہے؛ اس عہد کا کس تیقّن کے ساتھ انتظار ہے جسے جمہور کے ہاتھ سنواریں گے۔ وہ زمانہ جب طبقاتی نابرابری اور دوسرے نسلی امتیازات اُٹھ جائیں گے۔ عہدِ کہن کے مٹنے اور نئے دور کی آمد کے اس یقین ہی نے آزاد کی شاعری کو رجائی بنایا ہے۔

یہ رجائیت آزاد کی شاعری میں ہر جگہ ملے گی۔ مستقبل پر یہ بھروسہ، یہ اعتماد اِن کی شاعری کی رُوح ہے، یہی مرکز ہے جس کے گرد اِن کی شاعری گھومتی ہے۔ یہ بات صرف "میرا موضوعِ سخن" ہی میں نہیں ہے بلکہ ان کی دوسری نظموں میں بھی ہے۔ "زندگی" میں بھی یہ عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ زندگی کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے

ہر طرف سے گھٹا گھر کے آتی رہی

چار جانب اندھیرے گراتی رہی

تیرگی ایک عالم پہ چھاتی رہی

لیکن ایسے میں بھی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

ہر طرف اپنے نغمے لٹاتی رہی

زندگی حادثات سے بے خطر آگے بڑھتی ہے۔ اس کے آگے حادثات کہیں رکاوٹ نہیں بن سکے یہ بے پروا آگے بڑھتی رہی ہے۔

حادثے دیکھ کر

قہقہے حادثوں پہ لگاتی رہی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

زندگی بے نیازِ زمان و مکاں

زندگی بے نیازِ غمِ این و آں

زندگی بے نیازِ بہار و خزاں

متشدد ماحول میں

گنگناتی رہی، مُسکراتی رہی

اور ظلمات میں جگمگاتی رہی

اس نظم میں بحر بھی رواں استعمال کی گئی ہے جو زندگی کی روانی سے ایسی ہم آہنگ ہو گئی ہے کہ زندگی کے قدموں کی چاپ میں بھی سنگیت کا ترنم گھُل گیا ہے۔

رجائیت کی یہی رو ہے جو "روکلا سے پیرس تک" رواں دواں ہے۔ یہ زندگی ہے جو اپنے پرچم کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جو ہر قدم پر روشنیاں لٹا رہی ہے۔ امن اور شانتی کی یہ رَو اپنے دامن میں کتنے گلستاں کھلائے ہوئی ہے۔ آزاد نے اس نظم میں اس گلستاں کی خوشبو کو کھینچ لیا ہے

روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا

پرچمِ زندگی

اپنے ماحول سے نور لیتا ہُوا، اپنے ماحول کو نُور دیتا ہُوا

ہمسروں کی جبینیں جھکاتا ہُوا

— — — — — — — — —

روکلا سے چلا پرچمِ زندگی جگمگاتا ہُوا

مسکراتا ہوا

امن کے آشتی کے دلآویز نغمات گاتا ہوا

- - - - - - - - - - - - - - - - -

اس کو پورب میں پچھم میں لے کر چلو

اس کو اُتر میں دکھن میں لے کر چلو

تاکہ تشنہ لبوں کو مئے زندگی کا چھلکتا ہوا جام دے

اس نظم میں غضب کا بہاؤ ہے۔ اپنے ساتھ بہالے جانے والی روانی ہے۔ اور مواد کی مطابقت سے بحر بڑی رواں استعمال کی گئی ہے۔ اس میں مقبول عوام تحریک کی روانی ہے جو پچھم سے پورب اور اُتر سے دکھن بڑھ رہی ہے۔ اس آزاد نظم کے علاوہ "ذرو! قطرو!!" بھی ایک کامیاب نظم ہے جس میں شاعرانہ حسن کی کمی نہیں۔ "مرتی ہوئی سچائی" میں بھی آزاد شاعرانہ حسن قائم رکھ سکے ہیں، یہ بڑی بات ہے ورنہ اس نظم کا سپاٹ ہو جانا تعجب خیز بات نہ ہوتی، اس نظم کا استدلال اسے لے ڈوبتا۔ مگر اندازِ بیان نے سہارا دیا ہے۔ یہ بات اس لئے ممکن ہو سکی کہ آزاد نے اردو شاعری کے فن پر قدرت حاصل کر لی ہے۔

"جب حجابات اُٹھے" اور "عزائم" بھی کامیاب نظمیں ہیں۔ "جب حجابات اُٹھے" میں معنی اور حسنِ بیان کا بڑا عمدہ امتزاج ہے۔ اس توازن نے نظم کی اثر آفرینی کو بڑھا دیا ہے ـــــ یہ بات اس لئے ممکن ہو سکی ہے کہ آزاد جدید اُردو شاعری میں اُن چند شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنے کلاسیکی ادب سے استفادہ کیا ہے، جنھوں نے فن پر ہمیشہ نگاہ رکھی ہے۔ اور ان شاعروں کے اثر سے خود کو بچایا ہے جو فن اور مواد کے رشتوں کو اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں۔ جن کے یہاں الفاظ کی گھن گرج تو ہوتی ہے، جذبات کا سیلاب تو ہوتا ہے مگر شاعری کا حسن مفقود ہوتا ہے وہ صبر آزما تراش خراش جو مواد کو شاعری کا حسین پیکر عطا کرتی ہے جدید شعراء میں کم ہے۔ شاعری تقریر ہو سکتی ہے، فلسفہ ہو سکتی ہے، تاریخ ہو سکتی ہے ـــــ مگر تقریر شاعری نہیں ہو سکتی نہ فلسفہ شاعری ہے اور نہ تاریخ کو شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاعری میں مقصدیت ضروری ہے مگر مقصد پورا ہونے کے لئے اثر انگیزی ضروری ہے اور یہ فن کاری کے حسن سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے آزاد کے یہاں مقصدیت ضرور ہے مگر اُسے اُن کی فن کاری نے اتنے حسین روپ میں پیش کیا ہے کہ اس کا اثر بڑھ جاتا ہے اور دیرپا ہوتا ہے۔ آزاد کی شاعری میں فن اور مواد کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے ایک خاص توازن۔ انھوں نے دونوں عناصرِ ادب

ہیں سے کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی ہے۔ اور اس طرح شاعری کے ساتھ انصاف کیا ہے —— اور یہ بڑی بات ہے!

ماہنامہ "تہذیب" پٹنہ

ماہنامہ "آج کل" دہلی کے دفتر میں



کھڑے ہوئے:- بلونت سنگھ - جگن ناتھ آزاد - ساحر لدھیانوی
کرسیوں پر بیٹھے ہوئے:- بسمل سعیدی - جوش ملیح آبادی - جاں نثار اختر - دیوندر ستیارتھی - مجاز لکھنوی
سامنے:- عرش ملسیانی

آزاد کی شاعری

نریش کمار شاد

جگن ناتھ آزاد ذہنی اعتبار سے اردو کے اُن نوجوان شاعروں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے جدید و قدیم اُردو ادب اور اردو ادب کے علاوہ فارسی اور انگریزی ادب کے کافی اور عمیق مطالعہ کے بعد میدانِ شعر میں قدم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مجموعی حیثیت سے زبان و فن کے اکثر و بیشتر اسقام سے مبرّا ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور دل پذیر بھی ہے۔

آزاد کی شاعرانہ زندگی نے دراصل اُس وقت جنم لیا تھا جب اردو شاعری کی محراب میں اقبال کی مشعلِ فکر اپنی پوری تابانیوں سے جگمگا رہی تھی۔ اس وقت کے دوسرے لاتعداد شاعروں کی طرح آزاد کے شاعرانہ شعور نے بھی اس مشعل سے جلا حاصل کی

بلکہ دیگر اقبال پرست شعراء سے بھی کہیں زیادہ انھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتا
روشنی سے سنوارا اور نکھارا اور اس زمانے میں انھوں نے "یادِ اقبال" اور اس
دوسری کئی رباعیات میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایک مدّت
تک اُن کی شاعرانہ سوچ اور اندازِ بیان پر اقبال کا فلسفیانہ رنگ بڑی طرح چھایا رہا۔
اقبال کی تقلید نے جہاں ان کے طرزِ کلام میں گہرائی اور پختگی پیدا کرنے میں امداد دی،
وہاں اُن کی شاعرانہ انفرادیت پر پردہ بھی ڈال دیا۔ اس لئے آزاد اپنی ابتدائی شاعری
میں اپنے آپ کو نہیں پا سکے۔ اگر اس دور میں ان کے ہاں جدّتِ خیال یا ندرتِ بیان
کی کوئی مثال ملتی بھی ہے تو اس پر بھی اقبال کے فکر، اسلوب کی تہیں جمی ہوئی نظر
آتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے اثرات کی جڑیں آزاد کے فکر و نظر کے پاتال
تک پہنچ گئی ہیں اور ابھی تک گاہے گاہے اچانک اُن کے شعری آئینے میں اقبال
کے نقش و نگار لہرانے لگتے ہیں۔ جیسے

وہ صبح کے آثار نہ وہ لُطفِ صبوحی وہ شام کے انوار نہ وہ کیفِ شبانہ
اے سروِ سرافراختہ ہاں پردۂ شہنانہ لے مطربِ نوساختہ اک لحنِ چغانہ

یہ کاش کچھ نگاہِ عمیق لوٹ آئی　　عجیب گنبدِ بے در ہے جلوہ گاہِ صفات

رکھا

گلشن بھی ترے اور بہاریں بھی تری ہیں　　آزاد کا حصہ ہے فقط زخمِ نظارہ

لیکن ایسے اشعار کی تعداد اب انتہائی قلیل ہے۔ کیونکہ آزاد اپنی انفرادیت کی بقا کے لئے شعوری طور پر اپنے ذہن و دماغ سے اقبال کے اثرات کا پہرہ اُٹھا رہے ہیں اور ذہن کی گہرائیوں میں اپنے احساس اور اپنی سوچ کے چہروں کو پہچاننے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ اسی کامیابی نے ان کی شاعری کو قدیم و جدید کا ایک خوش گوار سنگم بنا دیا ہے۔ روایتی اسلوب اور قافیے کی پابندیوں کے سانچے میں انھوں نے زندگی کے نئے اور پرانے مسائل اور مشاہدات کو بڑی خوش اسلوبی اور چابک دستی سے ڈھالا ہے۔ اگرچہ "دائرے" اور "سکوت" ایسی نظمیں کہہ کر انھوں نے معریٰ نظمیں لکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے لیکن یہ تجربہ حسبِ توقع حوصلہ افزا نتائج کا متحمل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ان نظموں کے موضوع کے کسی قدر تنوّع کے باوجود مصرعوں کی بندش اور ساخت کا وہ تیکھا پن، توازن اور آہنگ پیدا نہیں ہو سکا جو ان کی پابند نظموں کی اہم خصوصیت ہے۔ اس لحاظ سے آزاد کے تخلص کی معنویت ان کی شاعری کی تکنیک کی ضد معلوم ہوتی ہے۔

آزاد کی موجودہ شاعری واضح طور پر دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ وہ ہے جس میں نظمیں کم اور غزلوں کی تعداد زیادہ ہے اور مجموعی طور پر اس حصّے کے ڈانڈے رومانی اور عشقیہ قسم کے موضوعات سے ملتے ہیں۔ اس حصّے کی نظموں اور خاص طور پر غزلوں کے اکثر و بیشتر شعروں میں ان کی شاعرانہ شخصیت کے صاف ستھرے رومانی خدوخال اپنے پورے بانکپن اور شگفتگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

اس حصّے کے متعدد دل کش و مؤثر اشعار میں محبّت اور رومان کی کئی تلخ و شیریں کیفیات کا امتزاج ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے رنگین و سنگین مشاہدات بڑے رسیلے انداز میں آزاد کے سخری پیکر میں منتقل ہو گئے ہیں کہیں وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر کسی کی بے وفائی کا راگ الاپتے ہوئے کہتے ہیں

پھر دل میں آ رہی ہے کسی بے وفا کی یاد — دنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہوں میں

یا

تری نظروں میں علاجِ غمِ دوراں ہے، مگر — ان سے اپنا تو علاجِ غمِ پنہاں نہ ہوا

یا

یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا — تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گزری

اور کہیں شاعر اپنے ذاتی تاثرات کی اساس پر یاسیت سے بھرپور لب ولہجہ میں ایسے ایسے شعری محل تعمیر کرتا ہے جن کے منارے آفاقی سرحدوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے

خیال غرقِ آرزو، نگاہ محوِ جستجو
پکارتی ہے زندگی کہاں ہے، تو کہاں ہے، تو
قریب و دور ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں چار سو

یہ اور بات ہے کہ آپ جگمگا رہا ہوں میں

عالمِ فانی میں اے دل ان کا تبسم دیکھ جنہیں
صبح کو شاخ پہ کھلنا ہے شام کو مرجھا جانا ہے

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر — دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

اور کہیں ان کی کرب آلود آواز کی گونج میں زندگی سے سمجھوتے کا مجبورانہ احساس کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے جیسے

اے دوست تری یاد نے بخشا وہ سہارا ہر تلخیٔ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

ہاں حریفِ قہقہہ آہ سرد ہی سہی
لب تو خندہ ریز ہیں دل میں درد ہی سہی

اور کہیں ان کی شاعرانہ قوت یاسیت اور پسپائیت کے سرد سنگیں اندھیروں کو چیر کر زندگی اور امید سے چھلکتے ہوئے اس قسم کے شعروں کی تخلیق کرتی ہے جیسے

پاؤں تھک گئے تو کیا آرزو میں دم تو ہے
آنکھ میں چمک تو ہے رُخ پہ گرد ہی سہی

ظلمتِ شب کی قسم پُرپیچ راہوں کی قسم
ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمتِ مردانہ ہم

اس حصے میں وہ نظمیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جو آزاد نے اپنی

مرحوم بیوی کی یاد میں قلمبند کی ہیں۔ ان نظموں میں آزاد کی شاعری کا سارا خلوص جیسے سمٹ کر آ گیا ہے۔ ان کے پُر زور اور پُر جوش اسلوب کے ساتھ بے پناہ درد اور لا محدود کرب کا احساس بھی ملتا ہے۔ اس درد اور کرب نے اُن کی اِن ہنگامی اور ذاتی نظموں کے سینے میں بھی بقائے دوام کے چراغ روشن کر دئے ہیں۔ بجا ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہ منظومات آزاد کے فطری اور فکری گداز کی ایسی دل دوز تصویریں ہیں جن کو وقت اور حالات کا کوئی بُعد اور فاصلہ دھندلا نہیں سکتا۔ ان نظموں میں "تسکنتسلا" اور "ایک آرزو" کے بعض ٹکڑے تو شدّتِ احساس کی نایاب مثالیں ہیں ؎

بس اسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا ۔۔۔ پتھروں پر ڈگمگاتا جا بجا پھرتا رہا

چاند تارو! وہ سماں کتنا الم آثار تھا ۔۔۔ میری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا

اے گرفتارِ تپِ کہنہ قرارِ چشم و دل ۔۔۔ ایک مدّت تک رہی ہے تُو علیل و مضمحل

شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا ۔۔۔ شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا

سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے ۔۔۔ اب ترے ہر درد ہر تکلیف کو آرام ہے

اب نہ کُڑھے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر ۔۔۔ اور اس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر

جو ترے دامن میں آیا مسکرایا چل بسا ۔۔۔ جس کو یہ انداز دُنیا کا نہ بھایا چل بسا

اب نہ ہم کڑوی دوا دارو پلائیں گے تجھے ۔۔۔ اب نہ بیماروں کے بستر پہ سلائیں گے تجھے

عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے — میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے

ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایام نے — تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے

چُن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں — گوہرِ اشکِ رواں دے کر انہیں لایا ہوں میں

(شکنتلا)

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار — قسمتِ بیدارِ ہر دردِ نہاں کی چارہ کار

ہو گئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں — یا ٹھکانا کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں

دیدۂ آہو میں ہے یا تو رمِ آہو میں ہے — کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

تتلیوں کے خوش نما رنگوں میں آرامیدہ ہے — وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

جنتِ گم گشتہ پوشیدہ تر از کیفِ بہار — جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار

آ کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند — اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

(ایک آرزو)

آزاد کی شاعری کے دوسرے حصے کی نظمیں اور غزلیں ان کے سیاسی نظریات کی آئینہ دار ہیں جو ہیئت اور اسلوب کی سحرکاری کے باوجود خطرناک حد تک متضاد نظریوں کی حامل ہیں۔ خاص طور پر ۱۵۔ اگست سے پہلے کی کہی ہوئی منظومات میں تو ان کے سیاسی شعور کا پس منظر بہت مبہم اور غیر واضح نظر آتا ہے

اگر ایک طرف وہ "انڈیا گیٹ" کو خالص ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے وہ سامراج کے زرخرید سپاہیوں کی بے بنیاد جرأت اور بہادری کی کھلی اڑاتے ہوئے اس قسم کے شعر لکھتے ہیں

واہ کیا جوشِ تہور کا ہے اللہ غنی | ہر قدم سے ہے عیاں حسرتِ شمشیر زنی
بھوک ہر شخص کو جانبازِ بنا دیتی ہے | اور افلاس رہِ منزلِ حبّ الوطنی

دشت و کہسار پہ رکھتے ہیں کچھ اس طرح قدم | زیر و بم چال کا کھاتا ہے ارادوں کی قسم
ہند کی فوج ظفر موج جہاں جائے گی | گاڑ دے گی وہیں انگریز کی نصرت کا علم

(انڈیا گیٹ)

تو دوسری طرف سبھاش چندر بوس کی انقلابی فسطائیت کا غلط اور جذباتی زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کرتے ہوئے بڑے جذباتی اور اخباری انداز میں سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے

السّلام اے تاجدارِ کشورِ ہندوستاں | اے شہید اے جاں سپارِ کشورِ ہندوستاں
السّلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار | اے شہنشاہِ دیارِ دل فقیرِ بے دیار
اے شہرِ خوابیدہ اے تقدیرِ بیدارِ وطن [1] | آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن

---

[1] مصنف کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاعر نے ان اشعار میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر سے خطاب کیا ہے (ح س۔)

خاک تیری قبر کی میری زیارت گاہ ہے   آج اس مٹی سے میرے دل کو دسم وراہ ہے

(سبھاش چندر بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر)

یا

جے ہند کی صداؤں میں ہم جواں بڑھیں   ہاتھوں میں لے کے امن و اماں کا نشاں بڑھیں

نصرت نصیب آگے قدم ہوں جہاں بڑھیں   بہر وفائے عظمت ہندوستاں بڑھیں

دنیا کو بھی وہ شاد کریں ہند کو بھی شاد

ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد   (آزاد ہند فوج)

اور اگر کہیں وہ اس قسم کے شعروں میں اپنے سماجی شعور کی بالیدگی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں

سماج کے اے قدیم ڈھانچے حیات سے تازگی چُرا کر

سنور رہا ہے تو کس لئے تُو تجھے تو اب ٹوٹنا پڑے گا

پلانے والے خبر بھی ہے پستی و بلندی رہا ہو جس میں

یہ پینے والوں کے ہیں ارادے وہ میکدہ ٹوٹنا پڑے گا

تو کہیں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سماجی مقام متعین کرتے وقت موجودہ دور کے انحطاط پذیر اور انا پرست فن کار کی طرح اپنی ذات کے خول میں گم سم ہو کر

بہت متعجب اور سراسیمہ دکھائی دیتے ہیں

محفل نے مری بات کو پایا ہی نہیں　　　مطرب نے ابھی ساز اُٹھایا ہی نہیں

حیراں ہوں کہ جس دور کا شاعر ہوں میں　　　وہ دور گزر چکا کہ آیا ہی نہیں

لیکن تقسیمِ ہند اور اس کے بعد کے حادثات و نتائج سے متاثر ہو کر ان کی شاعری نے جو تازہ ترین کروٹ لی ہے اسی پر ان کی تمام شاعری کا دار و مدار ہے۔ ان منظومات سے ان کے ذہنی اُفق سے نظریات و عقائد کے نئے آفتابوں کے طلوع ہونے کے آثار ملتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے متعدد نئے اور اُبھرتے ہوئے ذہین شاعروں کی طرح تبادلۂ آبادی اور فسادات کی بہیمیت کی صورت میں سامراجی ایجنٹوں کی شیطنت اور چنگیزیت نے ان کے سیاسی اور سماجی شعور کو بھی خواب آور دھندلکوں کے پیچاک سے نکال کر جیتی جاگتی حقیقتوں کے قریب کر دیا ہے اور جب وہ نام نہاد "آزادی" کی بہار پر طنز کرتے ہوئے بڑے تلخ لہجے میں کہتے ہیں کہ

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے
بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے

جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائے گی

خزاں کی طرح آئے گی چمن میں بھیل جائے گی

(پس پردہ)

تو یوں خیال ہوتا ہے جیسے ان حقائق کی روشنی میں انھوں نے اس لُوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے خونی اور سفاک چہروں کو پہچان لیا ہے۔ جنھوں نے عوام کو آزادی کا فریب دے کر ان کے آنسوؤں اور ان کی مسرتوں کے خون سے اپنے راج محلوں میں دئے جلائے ہیں اور یہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے جب وہ اربابِ حکومت کے فاشی چہرے سے جمہوریت کی نقاب اُٹھاتے ہوئے کہہ اُٹھتے ہیں کہ

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
تیرے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے
آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط
حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے
کون اس دور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز
نطق پروردۂ احکام رواں آج بھی ہے

(آزادی کے بعد)

اور جب وُہ رُوس اور پیرس کی امن کانفرنسوں کی غرض و غایت اور اہمیت کو

خلوص دل سے محسوس کرنے کے بعد انہیں اپنا موضوعِ سخن بناتے ہیں تو اُن کے ایک ایک بول سے جیسے اُمید کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔

روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا
پیمِ زندگی
اپنے ماحول سے نور لیتا ہوا ـــــ اپنے ماحول کو نور دیتا ہُوا
اہلِ دانش کے ہاتھوں نے تھاما اسے
علم والوں نے اس کو سہارا دیا
کہنہ عالم کی بنیاد پر عالمِ نَو کی محفل سجاتا ہُوا
جا کے یورپ کے اک میکدہ میں رُکا
اور گویا ہُوا :-
"میکدہ زندگانی کا ویران ہے
ایک صحرا کی مانند سنسان ہے
میکشو خواب سے جاگ اُٹھو
لاؤ گردش میں پیمانۂ زندگی
چھوڑ کر لغو و مہمل فسانوں کو اب

"آؤ دہرائیں افسانۂ زندگی"

(رودکلا سے پیرس تک)

اور پھر ادب اور عوام کے تاریخی رشتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب وہ کہتے ہیں

مجھ کو اس بات سے نہیں انکار — زندگی بحر ہے بغیر کنار
زندگی اشتراکیت ہی نہیں — اس کی زد میں ہیں آسمان زمیں
زندگی کے وسیع میداں میں — اس گلستاں میں اس بیاباں میں
عزمِ کردار بھی حقیقت ہے — ذہنِ بیدار بھی حقیقت ہے
گرچہ دونوں حقیقتیں ہیں مگر — اس سے انکار ہو سکے کیونکر

ایک مرتی ہوئی حقیقت ہے
اک ابھرتی ہوئی حقیقت ہے

(مرتی ہوئی سچائی)

تو ان کے شعور کی بیداری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

لیکن یہاں ایک چیز بری طرح کھٹکتی ہے وہ یہ کہ آزاد ان نظموں میں بڑے دبے دبے ہلکے پھلکے اور رومانوی اسلوب میں زندگی اور سماج کی ان عالمگیر سچائیوں کے گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں وہ تندی، للکار اور بے باکی نہیں ملتی

جوان نظموں کے موضوع کا اہم تقاضا ہے۔

دراصل آزاد کا شاعرانہ شعور طرح طرح کے کٹیلے اور خار زار راستوں سے گزرتا ہُوا ایسے نازک اور تاریخی دوراہے پر آپہنچا ہے جہاں اُن کو اپنی آئینۂ شاعری کے لئے راستہ وضع کرتے ہوئے انتہائی سُوجھ بُوجھ دُور بینی اور احتیاط سے کام لینا ہے۔ یہ دوراہا ان کی عوام دوستی اور انسانیت نوازی کی ایک کڑی آزمائش ہے۔ ان کے خلوص اور محبّت کا بڑا سخت امتحان ہے۔ اس وقت ان کی ذرا سی لغزش اور بے توجہی ان کے ذہنی ارتقاء کے پہیے کو اُلٹا گھما سکتی ہے۔ کیونکہ اس دوراہے سے ایک راستہ اپنی تمام تر ظاہری دل فریبی اور رعنائی کے باوجود پھر اُنہی کھوکھلے رومانوں اور یاسیت اور فراریت کے دھوئیں دھار دُھندلکوں سے جا ملتا ہے جہاں پے بہ پے ٹھوکریں کھانے کے بعد آزاد یہاں تک پہنچے ہیں اور اس دوراہے کا دوسرا راستہ بے شمار صعوبتوں اور دشواریوں کا راستہ ہے۔ لیکن آج کے محنت کش جمہور کا قافلہ اسی راستے پر گرمِ سفر ہے کیونکہ یہ راستہ سچّائی، روشنی اور انقلاب کا راستہ ہے یہی وہ راستہ ہے جو اُبھرتی ہوئی انسانیت کو اس نئی منزل کی طرف لاتا ہے جہاں حسین اور خوشحال زندگی کی بہاریں جھوم جھوم کر عوام کو خوش آمدید کہہ رہی ہیں اور جہاں ایک پُر امن اور پُر مسرّت سماج کے تابناک سورج کی لہراتی ہوئی

کرنیں کائنات کے ذرّے ذرّے کی آنکھوں میں حُسن و مستی کا جادو جگا رہی ہیں۔ اگر واقعی آزاد ان کے اپنے الفاظ میں مرتی ہوئی حقیقت کے نہیں بلکہ اُبھرتی ہوئی حقیقت کے پرستار ہیں تو انہیں بہرحال اور بہر قیمت اسی مؤخر الذکر راستے پر چلنا ہوگا۔

ماہنامہ "شعاعیں" دہلی

جگن ناتھ آزاد

اشرف بھوپالی

اُردو کی مخالفت کے اس دور میں جب کہ اس کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر مطعون و مردود قرار دیا جا رہا ہے یہ کہتے ہوئے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی مشترکہ زبان ہے، دل ڈرتا ہے لیکن دل کے ڈرنے سے حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے اور رہے گی کہ اُردو ادب کسی مخصوص گروہ یا فرقہ کا ہی سرمایہ نہیں بلکہ ایک ایسا خزانہ ہے جس پر ہندو اور مسلمان دونوں برابر کا حق رکھتے ہیں۔

اُردو جس طرح پیدا ہوئی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مختلف فرقوں کے امتزاج نے اسے پیدا کیا اور اس کا تمام سرمایۂ ادب بھی انھیں فرقوں کے افراد کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو ادب میں اگر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اور پنڈت

دیا شنکر نسیم کی گلِ بکاؤلی نہ ہوتی تو اردو ادب کا پیمانہ بڑی حد تک تشنہ رہتا۔ پھر ہندوؤں کا اُردو سے شغف کسی مخصوص زمانہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ہر دور اور ہر زمانہ میں ان گنت ہندو ادیب اور شاعر اردو ادب کے دامن کو مالا مال کرتے رہے ہیں۔

اگر اُردو کے آنجہانی ہندو شعراء سرشار، برق، شاد، نظیر، چکبست، رواں وغیرہ کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو دورِ جدید کے ساحر، کیفی، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، بیتاب بریلوی، تلوک چند محروم، فراق اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے

جگن ناتھ آزاد کا نام میں نے سنا تو تھا لیکن کبھی اُن کے کلام پر توجہ نہیں کی تھی کچھ عرصہ ہوا اتفاق سے —— ان کا مندرجہ ذیل قطعہ میرے سامنے آگیا۔

اک روشنی اُفق پہ نمایاں ہوئی تو تھی ۔۔۔ اور اس سے جگمگا تو اُٹھا تھا یہ خاکداں
ہر سمت سے اگرچہ ہواؤں کا زور تھا ۔۔۔ قندیل سی فضا میں فروزاں ہوئی تو تھی

o——o

لیکن وہ ضو کہ جس کو فریبِ نظر کہیں ۔۔۔ چشمک تھی برق کی کہ تبسم شرار کا
منزل بھی گم رہی رہِ منزل بھی بے نشاں ۔۔۔ اب کیا اسے چراغِ سرِ رہگذر کہیں

o——o

انوار وہ پلٹ کے نہ جانے کہاں گئے ۔۔۔ دیکھا تو پھر فضا میں دھندلکے تھے گرم سیر
پردہ سا تا بحدِ نظر پھیلتا گیا ۔۔۔ جلوے سمٹ سمٹ کے نہ جانے کہاں گئے

o——o

میں نے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ شاعر کے پورے ذہن کی تصویر میرے سامنے آ گئی اور وہ کیف آگیں فضا میرے ذہن پر مرتسم ہو گئی جس کو اس قطعہ کا پس منظر کہہ سکتے ہیں۔ اور میرے دل میں ان کا مزید کلام دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ میں نے مذکورہ بالا قطعہ کے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر جب اپنے عزیز دوست اسرار احمد صاحب آزاد سے کیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ جگن ناتھ آزاد تلوک چند صاحب محروم کے فرزند ہیں اور میرے دل سے بے ساختہ آواز آئی کہ اگر محروم کا لڑکا ایسے شعر نہیں کہے گا تو کون کہے گا۔

پھر ایک دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ مجھے ان کا دیوان "بیکراں" دیکھنے کو مل گیا جس کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ ہر چند جگن ناتھ آزاد مشہور سہی لیکن ابھی ان کو وہ قبولِ عام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ میرے اس احساس کا زمانہ وہ ہے جب ہندی ہندی کے نقّارے بج رہے ہیں اور "صدائے اُردو" طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہے ایسے نازک وقت میں میں نے یہ محسوس کیا کہ اُردو کے ہندو ادبا اور شعراء کو زیادہ سے زیادہ (بشرطِ استحقاقِ ذاتی) اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے اور یہی جذبہ اس مقالہ کے لکھنے کا باعث ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھے شعر شاعر کو روشناس کرانے میں کبھی ناکام نہیں

رہتے۔ لیکن اس کے باوجود "منقد و نظر" کی منزل باقی رہتی ہے کیونکہ یہی وہ کسوٹی ہے جہاں پہنچ کر عوام کا ذہن مخصوص پسندیدگی یا ناپسندیدگی اختیار کرنا شروع کرتا ہے۔ اور یہیں سے کسی شاعر کی مقبولیت کا (میرا مطلب ہے پائیدار قبولِ عام کا) آغاز ہوتا ہے۔

اچھے شعر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ پڑھنے یا سننے والا شاعر کے تصورات یا تاثرات میں کھو جائے۔ لیکن میرے خیال میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ پڑھنے یا سننے والا شاعر کے تصورات یا تاثرات کو خود ہی اپنی واردات تصور کرنے لگے یا یہ الفاظ دیگر قاری یا سامع یہ محسوس کرے کہ اس کے تاثرات و احساسات بھی وہی ہیں اور شاعر اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر ان کو ادا کر گیا اور وہ خود ادا نہ کر سکا۔

شاید مرزا غالب نے اسی مفہوم کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

علاّمہ سیماب اکبرآبادی نے بھی کہا ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سُنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اگر میری ترمیم کردہ تعریف کو کسوٹی قرار دے دیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ بہت کم شاعر

اس پر پورے اُتریں گے۔ لیکن جگن ناتھ آزاد کا یہ کمال ہے کہ وہ اس معیار کی بہت کچھ مطابقت کر جاتے ہیں۔

حصولِ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ جنونی کشت و خون کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ آج بھی ہمارے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہے۔ اور تاریخ کے اس بدترین سانحہ سے ہمارے کچھ تاثرات اور احساسات بھی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے عنوان سے ایک غزل نما نظم لکھی ہے۔ اس کو پڑھئے اور داد دیجئے کہ بلا کم و کاست ہمارے ہی احساسات و تاثرات کی ترجمانی ہے۔ کہتے ہیں ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

پہلے شعر میں یہی تو کہا ہے نا، کہ دیوانوں کی دیوانگیاں تو اس لئے قابلِ درگزر ہیں کہ وہ دیوانے ہیں لیکن یہ "ذی ہوش بزرگوں" نے کیا کیا ہے؟ تیسرے شعر میں جنونِ سرفروشی کہہ کر انگریزوں کے بالمقابل قربانی کے جذبہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور

پھر اس کے افسانوں کی دھجیوں کو آوارہ بنا کر جس طرح اس کے انجام کو دکھایا ہے وہ یقیناً اس نوجوان ہی کا حصّہ ہے۔ چوتھے شعر میں آزادی کے حصول کی تڑپ اور حصول کے بعد ہماری دیوانگی کا جس لطیف پیرایہ میں اظہار ہے اس کی مثال مشکل سے مل سکیگی۔ پانچویں شعر میں مذہبی جنون پر نہایت ہی رنگین و لطیف طنز ہے۔ شاید فسادات پر اس سے بہتر نظم نہیں کہی گئی۔ اس قسم کے حسین ارشادات سے آزاد کا کلام بھرا پڑا ہے۔

شاعر بعض وقت واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔ یہ وقت شاعر اور نثر نگار دونوں کے لئے بڑا نازک ہوتا ہے۔ پھر بھی شاعر کے مقابلے میں نثر نگار کا کام زیادہ آسان ہوتا ہے۔ وہ تو سیدھے سادے لفظوں میں تبصرہ کر کے اپنا دامن چھڑا لیتا ہے۔ لیکن شاعر کو تمام شاعرانہ اوصاف بھی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اس کو حسنِ ادا، اسلوبِ بیان، ایجازِ کلام وغیرہ کے ساتھ تبصرہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں صرف ایک چیز شاعر کو کامیاب بناتی ہے اور یہ اس کا خلوص ہے یعنی اپنی رائے میں نیک نیتی۔۔ جن لوگوں نے ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا اور جنھوں نے اس کو تسلیم کیا۔ دونوں نے بعد میں محسوس کیا کہ ان سے بھول ہوئی۔ آزاد نے بھی اس بھول کا اعتراف کیا اور "نئی محفل" کے عنوان سے ایک نظم کہی۔ ملک کی تقسیم کے بعد نئی محفل عالمِ وجود میں آئی۔ آزاد اس نئی محفل کو ایک ایسی زرخیز زمین سے تشبیہ دیتے ہیں جو بعد میں بنجر ہو گئی ہو۔ اقتباس

ملاحظہ کیجیے، اور تبصرے کے خلوص کی تعریف کیجیے ؎

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنے بنائیں بھی تو کیا ہوگا

دلوں کا غیض جب اے دوست چہرے سے نمایاں ہو
گلے شکوے زباں پہ ہم جو لائیں بھی تو کیا ہوگا

جنوں ہی کارفرما ہو جہاں اطرافِ عالم میں
وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ماحول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو
وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں آزاد تاحدِ نظر بنجر زمینیں ہوں
گھٹائیں آن کر بارش لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبان میں سلاست اور روانی ہو۔ چنانچہ ان اشعار کو معیاری تصور کیا جاتا ہے جو اپنی روانی اور سلاست کے اعتبار سے آسانی سے ہی نثر کی صورت میں بدلے جا سکتے ہوں، بالفاظِ دیگر جن کی نثر کرنا مشکل نہ ہو یا پھر یوں کہئے کہ اُن کی نثر کرتے وقت الفاظ کی زیادہ اُلٹ پھیر نہ کرنا پڑے اور پورے جملے بنانے کے لئے زیادہ الفاظ نہ بڑھانا پڑیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے آزاد کے کلام میں یہ خصوصیت بہت حد تک پائی جاتی ہے۔ اُن کی ایک نظم ہے "شکنتلا" اس کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں جو سلاست اور روانی کی بہت اچھی مثال ہیں ؎

ریل گاڑی رُک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

سلسلہ ناناوتی گاہے نظر کے سامنے ۔۔۔ پھر وہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے

دیکھ لے اک بار پھر اے دیدۂ خوں نابہ بار ۔۔۔ سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہُوا جاتا ہوں میں ۔۔۔ ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

الفاظ کا انتخاب بھی شعر کو مؤثر اور حسین بنانے کے لئے بہت ضروری ہے لیکن انتخاب کا مسئلہ محض شاعر کے ذوقِ سلیم پر ہے۔ جس شاعر کا ذوقِ سلیم جس قدر مکمل ہوگا اُسی قدر وہ اس وصف میں کامیاب ہوگا۔ الفاظ کے انتخاب میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی کو جو کمال حاصل ہے وہ میں نے کسی دوسرے شاعر میں نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادؔ اس معاملے میں حضرت جوشؔ کا اتباع کرتے ہیں۔ اگرچہ ابھی ان کو وہ کمال حاصل نہیں ہو سکا (اور ابھی اس کم عمری میں ہو بھی کیسے سکتا ہے) پھر بھی بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ الفاظ کا اچھا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض مثالیں میرے اس دعویٰ کا ثبوت ہیں ؎

میں نے کھایا ہے تمھاری دلربائی کا فریب ۔۔۔ رنگ و بُو کا تازگی کا جانفزائی کا فریب

آج تو شاید مکان و لامکاں سے دُور ہے ۔۔۔ اس زمیں سے دُور ہے اس آسماں سے دُور ہے

چاند تاروں سے پرے ہے کہکشاں سے دُور ہے ۔۔۔ عقل سے، ادراک سے، وہم و گماں سے دُور ہے

حلقۂ روز و شب و شام و سحر سے دُور ہے ۔۔۔ تو جہاں بھی ہے مری حدِّ نظر سے دُور ہے

وہ صبح کے دامن میں جھلکتے ہوئے انوار — وہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہوا تارا

کس حسن سے بدمست گھٹاؤں میں ہوا غرق — کہسار کی چوٹی کا فلک بوس کنارا

سرمست ہوا ہے کہ ہے چلتا ہوا جادو — بدمست گھٹا ہے کہ جنوں کو ہے اشارا

اس قسم کی مثالیں آزاد کے کلام میں اکثر و بیشتر ملتی ہیں

شعر کی ظاہری صورت سے قطع نظر اس کی معنویت سب سے زیادہ اہم ہے معنویت سے مراد یہ ہے کہ شعر کے مرکزی خیال میں کوئی ندرت ہو۔ اسی ندرت زدہ خیال کو شاعر کا پیغام کہتے ہیں۔ جو بات آپ بار بار سنتے چلے آئیں وہ اپنی لطافت اور اپنے اثر کو کھو دیتی ہے۔ اس لئے اس کو پیغام نہیں کہتے۔ لیکن جب ایک اچھوتی سی بات کہی جائے اور وہ دل و دماغ کو متاثر کر جائے تو وہی پیغام بن جاتی ہے۔ غالب کی اسی معنویت نے اس کو یہ بلند درجہ عطا کیا۔ اقبال کی اسی معنویت نے اس کو "شاعر پیغامبر" بنا دیا لیکن واضح رہے کہ یہ مقام سال ہا سال کی مشق اور جہد کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شاعری کا آغاز تتبع سے کرتا ہے اور اگر اس میں ذاتی اہلیت بھی موجود ہیں اور وہ ایک متفکر دماغ رکھتا ہے تو مشاقی سے وہ اس بلند مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ آزاد کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غالب و اقبال کے بلند مقام تک پہنچ گئے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک متفکر دماغ کے مالک ہیں اور اس سعی میں مصروف ہیں اور ان کے

شعر کا مرکزی خیال کسی نہ کسی حد تک ندرت ضرور رکھتا ہے جس سے آئندہ بہت کچھ اُمیدیں باندھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم "آرزو" کے چند اشعار پیش ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم انھوں نے محبوبہ کی وفات پر لکھی ہے۔ نظم کی لطافت اپنا آپ جواب ہے۔ آپ بھی اس کے ایک حصہ سے لطف اُٹھایئے ؎

کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو
یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بُو

یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گُم
یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گُم

تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں
یا پسند آئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں

جس کو تو محبوب تھی تو اس فضا میں تو نہیں
تو پہاڑوں کی جنوں پرور ہوا میں تو نہیں

یہ چند اشعار ایک نظم کے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی یہی وصف جھلکتا ہے ؎

محفل میں آنے والے پروانوں کا کھیل بھی دیکھ
دوست کی محفل میں آ کر اب واپس کیا جاتا ہے

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے
عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک فسانہ

عشق کے حضور میں سُرخرو تو ہو گئے
دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

یہ کاش مجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گذری

گلشن میں خاموشی ہے مگر اس سوال پر
ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں

وغیرہ

کلچر اور شعر کا تعلق بہت قریبی ہے۔ تمدن کے اعتبار سے جو شاعر جس قدر بلند ہوگا اُسی قدر اُس کے اشعار میں بلندی ہوگی۔ شعر میں حسن ایک متمدن دماغ ہی پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر کے اس معیار کی جانچ کے لئے اس کی زندگی کا مطالعہ تو ہے ہی ضروری، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے اشعار خود اُس کا پتہ دے دیتے ہیں۔ آزاد میں یہ وصف بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں ایسی پاکیزگی اور نفاست ہے جس کی مثال بہت کم شعراء میں ملتی ہے۔ یہ نفاست اور پاکیزگی ان کے متمدن دماغ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کا درجہ ان کے ہم عصر شعراء میں بہت بلند ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ان کے رومانی اشعار میں بھی یہ وصف پوری طور چمکتا نظر آتا ہے۔

ہم ان کے مستقبل کے متعلق بہت تابناک پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ حضرت تلوک چند محروم کی گود میں پلا ہوا بچہ اگر آسمانِ ادب و شعر پر ماہتاب بن کر نہیں چمکے گا تو اور کیا ہوگا

اب محفلِ فنا بھی نگاہوں سے چھپ گئی
کتنی بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوانِ "بیکراں" سے ایک مختصر سا انتخاب ناظرین کے استفادے اور تفننِ طبع کے لئے پیش کر دیا جائے۔

اک بار اگر قفس کی ہوا راس آ گئی — اے خود فریب! پھر ہوسِ بال و پر کہاں

آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر — جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

اے گردشِ ایام خبردار خبردار — آساں نہیں کچھ نقشِ تمنا کا مٹانا

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے — کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

عشق کے حضور میں سرخرو تو ہو گئے — دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

نہ حل ہوئیں مشکلیں نظر کی اگرچہ دنیائے رنگ و بو میں

کبھی خرد پر کیا بھروسہ کبھی جنوں کا لیا سہارا

خبر نہیں بات کیا ہے جس سے چمن کے آنسو نکل پڑے ہیں

نہ جانے کیا کچھ بتا گیا ہے چمن کو پچھلے پہر کا تارا

رنگِ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں — ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی مفتِ نظر ہے وہی نیتوں کا عناد — بند اخلاص و مروت کی دکاں آج بھی ہے

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسم کا جواب

پھول کھل کر بھی حریفِ رخِ جاناں نہ ہوا

اُٹھّے وہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل — نوشانۂ افلاک پہ ڈھلکے بادل

سرشار جہاں ہوا ہے دو چھینٹوں سے — ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

(رباعی)

ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی — خاطرِ اندوہ گیں کو شادماں فرما کبھی

ہر شے کا ہے انداز بدلنے والا — ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا

مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں — اک نور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

(رباعی)

بس کاش تم کو بھی اہلِ وطن بتا سکتا — وطن سے دُور کسی بے وطن پہ کیا گذری

جُدا جب سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم — نہ پوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گذری

دل بھی ایک عجب بستی ہے دنیا کے معمورے میں

آبادی کی آبادی ہے ویرانے کا ویرانہ

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو

اس راز کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی
۱۵ اگست ۱۹۴۹ء

جگن ناتھ آزاد اور اُن کی شاعری

سعید سہروردی

جگن ناتھ آزاد اُردو کے محتاط اور نسبتاً کم لکھنے والے شاعروں میں ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کی ادبی کاوشوں نے ادب میں اپنی مستقل جگہ پیدا کر لی ہے۔ اردو داں طبقہ ان کے تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا کلام ایک مدت سے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی کئی کتابیں بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان دنوں وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ "بساطِ عالم" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ "بساطِ عالم" پڑھنے والے اور دیکھنے والے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے رسالے کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے محض صحافتی تجربہ کافی نہیں بلکہ زندگی کی قدروں کی پہچان ہونا بھی لازمی ہے۔ بیسویں صدی کی سیاست میں اسی عنصر کا فقدان ہے۔ جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ دنیا کی قومیں تعمیر اور ترقی کی ڈگر سے اس قدر دور ہٹ گئی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی پیدائش ۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں ہوئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نہ کوئی اُردو بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ یہاں کی زبان کو نہ پنجابی کہا جا سکتا ہے، نہ پشتو، اس میں پشتو کی کرختگی تو ضرور ہے لیکن پنجابی کی تیزی و طراری نہیں۔ ایک زمانے میں عیسیٰ خیل سرحد کا شہر تھا لیکن آج کل مغربی پنجاب کا شہر ہے۔

منشی تلوک چند محروم کا نام غالباً ہر اُس شخص نے سُنا ہوگا جسے موجودہ دَور کی اردو شاعری سے ذرا سی بھی دلچسپی ہوگی۔ جگن ناتھ آزاد ان کے صاحبزادے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کم از کم جگن ناتھ آزاد کے بارے میں تو یہ کلیہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ محروم صاحب جیسے نکتہ رس اور باکمال شاعر کی تربیت نے آزاد کی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کے ذوقِ سلیم کا عکس لڑکے کی فطرت پر پڑا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی بدولت اس بنجر علاقے میں بھی جگن ناتھ آزاد کی فطری صلاحیتوں کو سرسبز ہونے کا موقع ملا۔

جب جگن ناتھ آزاد دوسری جماعت میں تھے تو ایک مرتبہ ان کے والد صاحب نے دیوانِ غالب ان کے سامنے رکھ دیا اور یہ غزل ؎

کوئی امید بر نہیں آتی

پڑھنے کو کہا۔ غالباً وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بچے کی طبیعت میں موزونی ہے یا نہیں۔ بچے نے جب غزل سُنا دی تو محروم صاحب نے فرمایا۔۔ تم یقیناً ایک شاعر ہوگے۔۔۔ اور آج ہم آزاد کے ادبی شعور کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ محروم صاحب کی بصیرت نے لڑکے کے مستقبل کا کتنا صحیح تصوّر قائم کر لیا تھا۔

جب محروم صاحب کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ ہو گیا جو کوہستان کے دامن میں واقع ہے تو جگن ناتھ اپنے والد کے ساتھ یہاں آئے۔ اس مقام پر بھی دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح پہاڑوں پر مکان بنے ہوئے ہیں۔ راستے میں کالا باغ کے مقام پر اسٹیمر کے ذریعے سے دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا ہے، جب اسٹیمر دریا کے وسط میں پہنچا تو محروم نے مکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

پہاڑوں کے اوپر بنے ہیں مکان

جگن ناتھ نے فوراً دوسرا مصرع موزوں کر دیا

عجب ان کی صورت عجب ان کی شان

محروم صاحب بولے "صورت" نہیں "شوکت" کہو اس وقت شاید جگن ناتھ آزاد نے فن کی اس باریکی پر توجّہ نہ دی ہو لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس لفظی تبدیلی نے شعر کی خوبی میں کتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ کلور کوٹ پہنچ کر آزاد نے اس نظم کو مکمل کیا۔

جب محروم صاحب نے یہ نظم سنی تو ہنس پڑے۔ بچپن ہی میں جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی اس طرح ابتدا ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد نے میٹرک کا امتحان میانوالی سے پاس کیا۔ اس کے بعد محروم صاحب کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا۔ یہاں آزاد کو ایسی فضا میسّر آئی کہ ان کا سویا ہوا ذوقِ سخن پھر بیدار ہو گیا۔ یہاں محروم صاحب کی آمد پر اُن کے اعزاز میں انجمنِ ترقیٔ اُردو کی طرف سے دعوت دی گئی۔ آزاد اس وقت نوعمر تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہاں شعر و سخن کا سلسلہ بھی رہے گا تو اُن کی طبیعت بھی گدگدائی۔ مگر مدعو نہ تھے اس وجہ سے نہ جا سکے۔ اتّفاق کی بات کہ دو سال بعد اسی انجمن نے جگن ناتھ آزاد کو اپنا سیکرٹری منتخب کیا اور وہ دو سال تک اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس زمانے میں عبدالحمید عدم کا قیام بھی راولپنڈی میں تھا اور وہ محروم صاحب کے یہاں برابر آیا جایا کرتے تھے۔ عدم جب آتے تو اپنی نئی نظمیں سناتے اور محروم صاحب بھی اپنا کلام سناتے تھے مگر وہ نسبتاً کم کہتے تھے۔ اس ماحول نے آزاد کے ذہن پر اثر ڈالا لیکن عدم کے کلام سے متاثر ہونے کے باوجود آزاد نے کبھی اُن کی تقلید نہیں کی۔ بعد ازاں وہ اقبال کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھیں یہ اعتراف ہے کہ انھوں نے اقبال کی تقلید کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بہت جلد انھیں یہ احساس ہو گیا کہ

تتبع کرنے سے ان کی اپنی ہستی بالکل اُجاگر نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے ہر وقت گُم ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

انٹرمیڈیٹ کی تعلیم ڈی، اے، وی کالج میں ختم کرکے انھوں نے گارڈن کالج میں بی اے کی تعلیم شروع کی۔ پہلے تو انھوں نے نظم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نثر کے کچھ مضامین لکھے۔ لیکن انسان اپنی فطری صلاحیتوں سے بغاوت نہیں کرسکتا۔ چناں چہ بہت جلد آزاد کی طبیعت نے پھر شاعری کی طرف رجوع کیا

آزاد انٹرمیڈیٹ میں کالج میگزین کے ایڈیٹر منتخب کئے گئے تھے اور جب بی اے میں پہنچے تب بھی کالج میگزین کے اردو سیکشن کی ادارت ان کے سپرد تھی۔ اس وجہ سے میگزین کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اس کے بعد آزاد لاہور چلے آئے۔ یہاں شعر گوئی کے زیادہ مواقع انھیں نصیب ہوئے اور کلام 'شاہکار' 'ادبی دنیا' اور 'ادب لطیف' ایسے ممتاز رسائل میں شائع ہونے لگا۔ اخبارات میں کام کرنے کے بعد انھوں نے ایم اے کیا۔ ایم اے کے بعد وطنیت کے جوش میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے چند دوستوں کے ہمراہ اتحاد کا پرچم لئے پنجاب کے کونے کونے میں گھومے اور بلوچستان کی سرحد تک ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کرتے رہے۔

ایک زمانے تک پنجاب میں تقریریں کرنے کے بعد وہ پھر لاہور کے واحد کانگریسی اخبار "بے ہند" کے عملے میں نامہ نگار کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء تک وہاں رہے۔ اس کے بعد شمالی ہند اور خصوصاً پنجاب میں جو افراتفری پھیلی اس میں آزاد کو بھی لاہور چھوڑنا پڑا۔ اخبار تو جالندھر چلا گیا لیکن آزاد دہلی آئے انھوں نے اپنی مشہور غزل

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری

دہلی آنے کے بعد کہی۔

جگن ناتھ آزاد نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی۔ لیکن جہاں تک ان کے فن کا تعلق ہے ان کی غزلوں اور نظموں کو الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کا مخصوص رنگ دونوں جگہ ہی نمایاں ہے۔ انھوں نے اُردو کے روایتی تغزل کی پیروی نہیں کی اور دانستہ قدیم اساتذہ کی روش سے الگ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے موجودہ دَور کے بعض نوجوان شعراء کی تحریک کا ساتھ بھی نہیں دیا جو مغربی ادب سے متاثر ہونے کے بعد ہمارے کلاسیکی ادب کے نام سے بدکتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ کلاسیکی ادب کی تمام قدریں حال کے لئے نہیں۔ لیکن ہر ادبی تخلیق ایک فنّی تجربے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں فن کار کے طبعی اور ذہنی ماحول کی جھلک ہوتی ہے۔ کلاسیکی ادب

بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ کلاسیکی ادب سے بے نیاز رہ کر شاعر یا فن کار اپنے ماحول کلچر اور اپنی زبان کے مزاج سے مکمل طور پر روشناس نہیں ہو سکتا۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنے کسی ہمعصر کا رنگ بھی مستعار نہیں لیا۔ اگرچہ ان کی شاعری میں تمام ترقی پسند عناصر موجود ہیں لیکن ان کا رنگ منفرد ہے اور وہ اپنی ڈگر پر آج تک کامیابی سے چل رہے ہیں۔

وہ ہر موضوع پر اپنے تاثرات کو خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں احساس کی ترجمانی اور جذبات کی عکاسی میں کمال حاصل ہے لیکن وہ اتنی ہی خوبی کے ساتھ خارجی حقائق کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ اور موجودہ دور میں کوئی فن کار زندگی کی حقیقتوں سے فرار اختیار کر کے ادب میں کوئی مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ زندگی کے حقائق ادیب کا شانہ ہلاتے رہتے ہیں۔ اور خواہ وہ حقائق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں ادیب دلیری کے ساتھ ان کا سامنا کرتا ہے۔ آج کے شاعر کے لئے بہار ہی نہیں بلکہ خزاں بھی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے

نو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
نو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے (جگن ناتھ آزاد)

۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں نے اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کر دیے۔

لیکن وہ ملک میں بارود کے پرزے بکھر گئے تھے جو ذرا سی دیر میں مشتعل ہو گئے، جذبات سُلگ اُٹھے، دلوں میں آگ لگ گئی۔ مکانات جلنے لگے۔ کھیتیاں اُجڑنے لگیں، اور اُس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان شعلوں کی آنچ ہندستانی معاشرت کی تمام قدروں کو پگھلا دے گی۔ اخلاق، تہذیب اور کلچر کے اوراق بکھر جائیں گے اور گوتم اور گاندھی کی سرزمین میں راکھ کے سوا کچھ نہ رہ جائے گا ـــــ یہ ہندستان کی تاریخ کا سب سے المناک باب ہے۔ "یومِ آزادی" پر آزاد کی غزل اس دور کے ادب میں ایک امتیازی رتبہ رکھتی ہے۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ مے خانہ یہ مے خانوں پہ کیا گزری
فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری
وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری

نشانِ برگ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گذری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم چھینے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گذری

وہ رنگ و نور سے بھرپور شبستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گذری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گذری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گذری

ان واقعات اور حقائق سے متاثر ہو کر جگن ناتھ آزاد نے کئی اور نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔

ایک غزل کے چند اشعار ہیں ؎

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا

آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آجانے سے

ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ

کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا

نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے

یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر سنگ پارے کو کرشمہ کی شان حاصل ہو

نوادر ہم وہاں جا کر لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں

وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں انسان کو اونچے تخیل سے عداوت ہو

وہاں ہم موج میں تانیں اڑائیں بھی تو کیا ہوگا

تجلی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی

اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

جب اس محفل میں سننے پر نہیں ہے کوئی آمادہ

تو پھر ہم نطق کا جادو جگائیں بھی تو کیا ہوگا

اور یہ اشعار

اک بار گر قفس کی ہوا راس آ گئی ۔۔۔ اے خود فریب پھر ہوسِ بال و پر کہاں

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گذری ۔۔۔ نہ پوچھئے ہوس بال و پر پہ کیا گذری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا ۔۔۔ خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گذری

داستانِ عشق سے رنگیں ہے دل کی کائنات ۔۔۔ عشق افسانہ ہے لیکن سرخیٔ افسانہ ہم

بہار لائے گی نکہتوں کا جب ایک طوفاں تو کیا کریں گے

نہ رنگ و بو تھا نہ زمزمے تھے خزاں میں تو ہو گیا گذارا

یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن ۔۔۔ تیرے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے

آج بھی پائی نہیں دین سے دنیا نے نجات ۔۔۔ نالہ کش محفلِ صاحب نظراں آج بھی ہے

پھولوں سے بہاروں سے، ستاروں سے گزر جا
ہے دُور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

یہ آباد سا ویرانہ، یہ ویران سی آبادی
دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

خاک پہ دھندلے نقش فضا میں مٹتی مٹتی آوازیں
ایک منظر آزاد کہ یہ بھی چند جمیل افسانے ہیں

۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس ملک میں جو طوفان آیا اور لاکھوں پودے جڑ سے اُکھڑ گئے۔ کارواں در کارواں لوگ ٹھوکریں کھاتے ایک سمت سے دوسری سمت جانے لگے۔ فضا میں موت کے پیروں کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ آزاد کو بھی اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ ان کی بعض نظمیں اسی دور کی عکاس ہیں۔ "وطن میں آخری رات" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کے دو بند یہ ہیں:۔

نغمہ آباد میں یہ شہرِ خموشاں کا سکوت
زندگانی پہ عجب موت نے ڈالا سایا

کان میں دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ کو اے جذبۂ مشتاق کہاں لے آیا

آج یہ لرزہ براندام اُجالا، لیکن
آپ ہی آپ سمٹتا سا چلا جاتا ہے

کوئی برچھی، کوئی خنجر، کوئی پتّھر کوئی اینٹ
میرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

ایک دوسری غزل ہے ؎

بس اک نور چھلکتا ہُوا نظر آیا — پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گذری

جدا جب اس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم — نہ پوچھو عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گذری

وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر — نہ پوچھ مجھ سے کہ اس انجمن پہ کیا گذری

خموش کیوں ہیں قتیلؔ و ندیمؔ کچھ تو کہیں — ہمارے جیتے ہمارے وطن پہ کیا گذری

۱۹۴۶ء میں جگن ناتھ آزاد کی رفیقۂ حیات انتقال کر گئیں۔ اور اس صدمہ سے متاثر ہو کر انھوں نے دو نظمیں "شکنتلا" اور "ایک آرزو" کہیں۔ "شکنتلا" ادبی دُنیا نومبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہُوئی تھی۔ مولانا صلاح الدین نے اس نظم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہیں:-

"جگن ناتھ آزاد نے شکنتلا کے عنوان سے اپنی رفیقۂ حیات کا مرثیہ لکھا ہے۔ مرثیہ کیا ہے اشکِ خونیں کا ایک سیلاب ہے جو زمینِ شعر کو شاداب کرتا ہُوا منزلِ ابد کی طرف رواں ہے۔ آزاد نے مرثیہ لکھ کر حقیقتاً مرثیے کی اس صنف پر احسان کیا ہے جس کا تعلق رسمِ شعر سے نہیں غمِ دل سے ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کا مؤرخ اسے زبانِ اُردو کے بہترین مرثیوں میں جگہ دے گا۔ جذبات کا خروش اور الفاظ کا حسن دونوں اپنے عروج

پر نظر آتے ہیں اور حیرت کا مقام ہے کہ شاعر نے ایسی کیفیت میں کہ اس کا دل غم سے پارہ پارہ ہو رہا تھا، ایک ایسا ادبی شاہکار کیونکر تعمیر کیا مگر شاید ادبِ عالیہ کی تخلیق جذباتِ عالیہ کے ہیجان ہی کی دوسری صورت ہے اور مرنے والی کو کیا معلوم کہ اس کے پھولوں پر اس کے شوہر نے شعر کا تاج محل تعمیر کر کے اسے جاوداں کر دیا۔"

ریل گاڑی رک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریزِ آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

سلسلہ نانا وتی کا ہے نظر کے سامنے
پھر وہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے

دیکھ لے اک بار پھر اے دیدۂ خونبابہ بار
سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہوا جاتا ہوں میں
ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

خامشی سے نالہ کش ہے خاطرِ اندوہگیں
روح میں دھڑکن سی ہے جذبات پر قابو نہیں

نطق کو حاصل کہاں تابِ بیانِ زندگی
کہہ گئے آنسو چھلک کر داستانِ زندگی

آزاد کی نوائے درد میں جو تڑپ، چبھن اور چٹیلا پن ہے وہ اس نظم کو شاہکار بنا دیتی ہے۔ اس احساس کی لذت ہمہ گیر ہے۔ اس مرثیے کے آخری اشعار اُردو شاعری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ؏

عالمِ فردوس میں تم آج آرامیدہ ہے
میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے

روحِ باقی جا چکی ہے جسمِ فانی جل چکا
آج وہ میرا جہانِ شادمانی جل چکا

ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایام نے
تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے

چن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں
گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں

بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

دوسری المیہ نظم 'ایک آرزو' بھی انھیں تاثرات کی حامل ہے اور شاعر کے مجروح جذبات کی پوری طرح ترجمان ہے۔ یہ اشعار تو اپنا جواب نہیں رکھتے ؎

میں تو اتنا جانتا ہوں اے قرارِ چشم و دل
لے مری حدِ نظر اے انتظارِ چشم و دل

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب
"کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب

صبح تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا"
دور تک گو جستجو میں شوقِ دیوانہ گیا

دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے
کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی بے تابی میں ہے
یا مرے سوکھے ہوئے اشکوں کی نایابی میں ہے

آبِ گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تو
یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تو

مولانا صلاح الدین احمد اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں

"محبوبِ رفتہ کی جستجو کا ایسا لطیف اور درد انگیز اظہار بلند سے بلند شاعری کے لئے بھی باعثِ فخر ہو سکتا ہے۔"

جگن ناتھ آزاد اپنے فن پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں کا صحیح ادراک رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کے کلام میں کسی جگہ پر کھوکھلے پن کا احساس نہیں ہوتا ان کا ہر شعر زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں کوئی اُلجھاؤ نہیں انھوں نے کبھی نعروں کا سہارا نہیں لیا اور نہ ایک قدامت پرست فن کار کی حیثیت سے اپنے فن کو عروض کی زنجیروں کا غلام بنایا ہے۔

انھوں نے بعض بڑی کامیاب فکریہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ تقسیم سے قبل اُن کی نظموں کا ایک مجموعہ "نذرِ اقبال" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس کا موضوع خود اقبال اور کلامِ اقبال ہے۔ اس مجموعے کے متعلق سر عبد القادر لکھتے ہیں:۔

"یہ گویا عقیدت کے چند پھول ہیں جو انھوں نے اقبال پر نچھاور کئے ہیں اسی لحاظ سے اس مجموعے کو اقبال کی نذر کیا گیا ہے۔ جو بلیغ تعریفیں

ان اشعار میں آزاد کے قلم سے نکلی ہیں، اُن سے ان کا دلی جذبۂ محبّت نظر آرہا ہے۔ اور ان میں خوبی یہ ہے کہ مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا محض اظہارِ حقیقت ہے مثلاً یہ تواریخ ملاحظہ ہو ؎

وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند　　تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے

تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند　　مہ و ستارہ و برقِ تپاں و مہرِ مبیں

حال میں ان کی نظموں کا مجموعہ "طبل و علم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان نظموں کا موضوع کشمیر ہے۔ اس مجموعے میں بھی بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے 'طبل و علم' کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"اگر وقتی اور ہنگامی شاعری کو ایک ایسی زبردست شخصیت مل جاتی ہے جو اسے ادب کی ابدی قدروں سے مالامال کر دیتی ہے۔ تو ایسی شاعری پر بھی مہرِ دوام ثبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ طبل و علم کی نظموں کے ساتھ یہی استثنائی ردِّ عمل ہوا ہے۔ اور آزاد کے انفاسِ گرم نے ان میں وہ برقی رَو دوڑادی ہے جو ادب کے اُفق پر ہمیشہ درخشاں رہے گی۔"

عنقریب ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "بیکراں" کے عنوان سے شائع ہونے والا ہے۔ جو ان نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہوگا جنھیں ان کی شاعری کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔

آزاد کا فن زندگی سے عبارت ہے اور یہی فن کی عظمت کی کسوٹی ہے

وہ اپنے ماحول کے حقائق پر بڑی بے باکی سے تبصرہ کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو نیا دَور شروع ہُوا ہے۔ اس کے بارے میں ان کی نظم " نیا دَور ــــــ نئے رہزن " بہت کامیاب ہے۔

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست
چور گلشن سے اگر پھُول چُرا لیتے ہیں
حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجّب تو نہیں
راہ زن قافلے والوں کو اُڑا لیتے ہیں

اس نئے دَور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چُرائے جائیں
دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضو انجمِ تاباں سے اُڑائے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھُول پہ ڈاکہ ڈالے
پھُول موجود رہے پھُول میں خوشبو نہ رہے

حسن کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں

تیرا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

قعرِ دریا میں اُتر جائیں تو انجام یہ ہو

قعرِ دریا میں صدف تو رہے گوہر نہ رہے

اور مائل جو ترے ذہن پہ ہو ان کا دماغ

ذہن میں تیرے غرض تو رہے جوہر نہ رہے

اس نئے دور میں کہنا ہے یہی تجھ سے مجھے

کہ ترا ہوش رہے راہزنوں سے محتاط

تری محنت جو ترے حق میں ہے سامانِ الم

ہو کہیں اور نہ وہ خالقِ سامانِ نشاط

ماہنامہ "نئی زندگی" الہ آباد

نومبر ۱۹۴۹ء

جگن ناتھ آزاد

گوہر سعیدی ٹونکی

لوگ کہتے ہیں کہ تقلیدی شاعری کا دور ختم ہو گیا اور اب بساطِ ادب پر وہی شاعر چمک سکتا ہے جو اپنے کلام میں کوئی خصوصیت یا انفرادیت پیدا کر سکے۔ موجودہ تنقیدی زاویوں کے مطابق انفرادیت ضروری ہے اور بعض کے نزدیک وہ کامیاب شاعر نہیں جو اپنے لئے ایک علحدہ راہ نہ پیدا کر سکے۔ لیکن وہ انفرادیت کسی وقت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جو ادب و شعر کے اجتماعی اور مسلمہ اصولوں کو ٹھکرا کر بے راہ روی اور مہمل گوئی کی حد تک پہنچ جائے۔

تقلیدی شاعری کا اطلاق عموماً اس غزل پر ہو سکتا ہے جو قدیم غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی جاتی ہے۔ مگر جن شعرا نے تغزل میں واردات و جذبات کو بھی شامل کر دیا ہے۔

یا جن کے کلام میں محسوسات کا نام شاعری اور حسیات کا نام غزل ہے ان پر تقلید کا الزام مناسب نہیں۔ لیکن اس کے باوجود "غزل کی راگنی" موجودہ دور میں کسی طرح بھی بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ اُسی وقت زیب دے سکتی تھی جب کہ خوش حالی اور فارغ البالی کا ہر طرف دَور دورہ تھا۔ یا خود فریبی اور غلامی کی وجہ سے ہمارے قوائے ذہنی مضمحل ہو چکے تھے اور کاکل و رخسار، چمن زار و کوہسار کا ایسا چسکا لگا ہوا تھا کہ نگاہیں کسی دوسری جانب اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں اور ع

"شرابِ ناب کش و روئے مہ جبیناں بیں"

کی راگنی ہماری سرشار زندگی کی عود سے مہکی ہوئی زندیں محراب میں ہر وقت گونجا کرتی تھی۔

لیکن اب جب کہ ماہ و سال کے نہ جانے کتنے کارواں دل و دماغ سے گذر چکے ہیں۔ اور طوفانی موجوں میں نسبتاً ہمواری پیدا ہو چکی ہے۔ طبیعت میں وہ "یک در گیر و محکم گیر" کی شدت باقی نہیں رہی اور غمِ جاناں کے بجائے غمِ دوراں ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہو کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق اور فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر ہمارا ادب روائتی حدود سے نکل کر زندگی سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اس تحریک نے اس قدر گہرے نقوش چھوڑے کہ اُردو کے بیشتر نئے ادیب ترقی پسند بننے کے لئے مجبور ہو گئے۔

جگن ناتھ آزاد ہمارے ملک کے نوجوان شعراء میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

شاعری کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ لیکن اُن کی جواں طبیعت نے اس میراث پر قانع رہنا پسند نہیں کیا اور اس رنگ سے بغاوت اختیار کی۔ ذہنی کاوشوں سے شاعری کو سنوارا اور اس میں اپنے خونِ جگر کا اضافہ کیا اور ایسا اسلوب اختیار کیا جس کے امکانات وسیع ہیں۔

آزاد نے اپنے فن کا آغاز پوری آب و تاب کے ساتھ اس وقت کیا جب ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ آزادی کا سورج ابھرا ہی تھا کہ اس کو ایک نئی غلامی کی گھنی بدلیوں نے چھپا لیا۔ رجعت پسند قوتیں اپنا کام تیزی سے کرنے لگیں اور عوامی مسائل بجائے اُلجھنے کے سلجھ گئے۔ سامراج عوام کو اپنے سنہرے جالوں میں مضبوطی کے ساتھ کسنے لگا۔ امن، شانتی اور مساوات کے جو سنہرے سپنے عوام نے دیکھے تھے وہ ٹوٹ گئے۔

آزاد نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی لئے اُن سے خاموش نہ رہا گیا اور وہ بے اختیار پکار اُٹھے ؎

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے　　زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دیدہ ذرا غور سے دیکھ　　کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

رنگِ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں　　ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے
آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی　　دیدۂ دل بہ سر سوز گراں آج بھی ہے

یہ دیکھتے ہوئے بھی آزاد مایوس نہیں ہوئے اُن کے اشعار میں امید کی کرنیں نظر آتی ہیں۔ وہ انسانی لہو کی اس بے مصرف ارزانی پر تڑپ اُٹھتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوتے۔ کیونکہ انھیں یقین کامل ہے کہ صالح انقلاب کا دور جلد آئے گا جب اس غلط قسم کی خونریزی کے باوجود موجودہ سرمایہ داریت اور شہنشاہیت کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں گی ؎

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی ۔۔۔ لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں ۔۔۔ مری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

گرچہ انساں ہے زبوں حال مگر میرے دوست ۔۔۔ دورِ مستقبلِ انساں سے نہیں ہوں مایوس
مجھ کو اُمید بہت ابرِ گہربار پہ ہے ۔۔۔ میں ابھی خاکِ گلستاں سے نہیں ہوں مایوس

اور اسی لیے رجعت کی گھٹاٹوپ اندھیاریوں میں انہوں نے امن کی مشعل جلانے کی کوشش کی۔ نفاق کی آگ پر محبت اور میل ملاپ کا پانی چھڑکا اور اپنے تخیل میں خلوص، اعتماد، وسعت اور انسان دوستی کا گہرا رنگ بھرا اور ایک ترقی یافتہ خوش گوار معاشرت کی داغ بیل ڈالنے میں حصہ لیا۔ جس کے لئے وہ اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدت سے ۔۔۔ ذہنِ انساں کو اب اس دور میں بیدار کریں
دہر پر عدل و مساوات کا پرچم لہرائیں ۔۔۔ پرچمِ ظلم کو عالم میں نگوں سار کریں

حکم پابندیٔ صیاد کا جاری کر کے
جشنِ آزادیٔ مرغانِ گرفتار کریں

آزاد کی شاعری درا صل حقیقی شاعری ہے۔ اس شاعری کا سماج سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس میں ذاتی غم اور مسرتیں وسیع تر حقائق کا جزو معلوم ہوتی ہیں۔ وہ دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح "مزدور مارکہ" نظم لکھنا پسند نہیں کرتے لیکن ان کا سیاسی شعور بہت گہرا ہے۔ ان کی نظر دور رس اور ان کی تنقید کی اساس لطافت و نزاکت پر ہے سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کی فریب کاری کا سنہری پردہ جس طرح انھوں نے چاک کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست
چور گلشن سے اگر پھول چرا لیتے ہیں
حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجب تو نہیں
راہزن قافلے والوں کو اڑا لیتے ہیں

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں
دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضو انجمِ تاباں سے اڑا لے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول میں خوشبو نہ رہے
حرص کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں
ترا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

اس طرح آزاد کی کوئی بھی نظم لے لیجئے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کی گونج اس میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، تازگی اس کی شاعری کا خاصہ ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک محض چند لفظوں سے کھیلنا اور انقلاب انقلاب کی رٹ لگانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آزاد تمام زندگی کا راز دان اور ترجمان ہے۔ ان کا موضوعِ سخن مجروح انسانیت اور اس کا ارتقاء ہے۔ موجودہ بحرانی دور نے ان کے دل و دماغ پر اس قدر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی پُر آشوب زندگی میں ایک تڑپ اور حوصلہ مندی نظر آتی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری سردار جعفری کے الفاظ میں ایک دُکھی دل کی پکار ہی نہیں بلکہ عہدِ حاضر کے انسان کی للکار بھی ہے ؎

کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوانی   بہبودِ بشر کے یہ اگر کام نہ آئی
اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب   افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

اور ایک دوسری جگہ وہ اپنے عزائم کا بیان کرتے ہیں جس کے بل بوتے پر "نئی دنیا" کی ترقی و خوشحالی اور "نئے انسان" کے ترقی یافتہ رجحانات و احساسات کا سنگِ بنیاد رکھا گیا ہے ؎

دامنِ گیتی پہ نقش اپنا بٹھاتے جائیں گے   اس طرح اپنا قدم آگے بڑھاتے جائیں گے
کہنگی سے روح کو تسکین مل سکتی نہیں   اپنی دُھن میں اپنی ہی تانیں اڑاتے جائیں گے

ہم کوئی فتنہ کہیں بیدار دیکھیں گے اگر — اپنے سحر انگیز نغموں سے سُلاتے جائیں گے
چشمِ عالم میں تجلّی کی کمی دیکھیں گے جب — نور بن کر چشمِ عالم میں سماتے جائیں گے

ملک کو گرمجوشی کے ساتھ آزاد کا استقبال کرنا چاہیئے

"الجمعیۃ" دہلی
۲۲- دسمبر ۱۹۵۲ء

جگن ناتھ آزاد

ارشد کاکوی

ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدرِ شعبۂ اُردو و فارسی کا دفتر تھا۔ دو چار اشخاص بیٹھے تھے۔ عندلیب شادانی نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ لو بھئی خاور کے لئے آزاد نے ایک اچھی سی غزل بھیجی ہے۔ اسے رکھ لو۔ پھر کہا کہ دیکھنا کیا خوب کہا ہے کس بلا کا یہ شعر ہے ؎

بتایا جا رہا ہے قافلہ منزل پہ آ پہونچا   مگر اس قافلے کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

میں نے غزل پڑھی اور لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ میرے ایک دوسرے باذوق دوست نے غزل مجھ سے مانگی اور اسے پڑھ کر کہا کہ بھئی سچ پوچھو تو شعر یہ ہوا ہے ؎

تمہاری برق رفتاری بجا اے قافلے والو   مگر رفتارِ میرِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

لیکن ایک تیسرے صاحب نے اس شعر میں ایک خاص کیفیت پائی ؎

مرے دل سے بہارِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر آزاد یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

اس اختلافِ پسند کے باوجود جو عنصر اس پسند میں مشترک ہے وہ ایک خاص قسم کا رچا ہوا طنز ہے جس میں تلوار کی کاٹ نہیں بلکہ نشتر کی چُبھن ہے اور یہی کلامِ آزاد کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کا طنز اُبل پڑنے کا طنز نہیں بلکہ اس میں ایک ضبط و پندار ہے۔ مندرجہ بالا واقعے کے بعد میں نے قصداً اسی قسم کا ایک تجربہ اور کیا۔ بہت دن ہوئے آزاد نے مجھے ایک غزل بھیجی تھی۔ میں نے وہ غزل فرداً فرداً دو تین باذوق لوگوں کے سامنے رکھی تو اختلافِ نظر کا ایک اور تجربہ ہاتھ آیا۔ ایک صاحب اس شعر پر جھوم اُٹھے ؎

زمانے بھر کو جب محویتوں میں بھول جاتا ہوں
تو اک تیرے جدا ہونے کا منظر یاد ہوتا ہے

دوسرے صاحب اپنی مہاجرانہ بود و باش کے زیرِ اثر اس شعر پر تڑپ اُٹھے ؎

بہارِ جانفزا آنے پہ بھی ناشاد ہوتا ہے
جسے اپنے نشیمن کا اُجڑنا یاد ہوتا ہے

اور جب شمعِ انتخاب میرے سامنے لائی گئی تو میں نے کہا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو خود آزاد سے جا کر پوچھو تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ دراصل اُن سے اس شعر نے غزل کہلوائی ہے ؎

خدا جانے یہ کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اُٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

ان دو تجربوں سے آزاد کے حلقۂ تاثیر کا تھوڑا بہت اندازہ آپ کو بھی ہو گیا ہوگا۔

اور وہ یہ کہ آزاد اس دَور کے محض ان احساسات کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں جو عبارت ہیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے۔ یہ تو سبھی شاعر کرتے ہیں۔ آزاد کے کلام میں اس دَور کے اس درد کا بھی درماں اور اس زخم کا بھی مرہم ہے جو غمِ عشق و غمِ روزگار دونوں سے یکسر مختلف ہے۔ اگر آپ اس غم کو کوئی نام دینے پر مُصر ہیں تو اسے "غمِ آشیاں" کہہ لیجئے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

آزاد کے یہاں یہ "کبھی" ایک دائمی خلش بن گئی ہے۔ وحید اللہ آبادی کا ایک شعر ہے اور بے پناہ شعر ہے کہ ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

آزاد کے یہاں یادِ وطن، وادیٔ غربت تک ساتھ آ گئی ہے۔ وہ اکثر اربابِ احبابِ وطن کی یاد میں تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وطن کی سرزمین اور شاید وہاں کی کسی مہ جبیں کی بھی یاد ان کی سانسوں میں بس گئی ہے۔ فراقِ وطن کا یہ احساس کہ یہ فراق دائمی ہے اور اب یادِ وطن پر بھی احتساب ہے، آزاد کے غم کا المناک پہلو ہے اور یہی وہ "سکونِ یاس" ہے جس نے اُن کے غمِ وطن میں بھی ایک ضبط کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ محرومیٔ جاوید نے

آزاد کے غم کو ایک بندار دے دیا ہے۔ وہ اپنے وطن کی یاد اسی ضبط و احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں جیسے کوئی بوڑھا اپنے شباب کو یاد کرتا ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قفس پر قناعت کرنے یا قفس میں جی لگانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے جو ناطق کے اس شعر میں ہے کہ ؎

صیّاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
ہم نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

یہ بڑے جگر اور بڑے حوصلے کا کام ہے لیکن اس سے زیادہ حوصلے کا کام یہ ہے کہ قفس کو آشیاں ہی سمجھ لیا جائے۔ دوسری صورت میں زیادہ عافیت ہے اور یہی آزاد نے کیا ہے۔ قفس کو قفس سمجھنے کا تصوّر "جبری" تصوّر ہے اور "دل" سے یہ ممکن نہیں۔ یہ "دماغ" کا کام ہے۔ "دل" اگر چاہے تو قفس کو آشیاں سمجھ لینے کا "اختیاری" تصوّر خود پر طاری کر سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آزاد کے یہاں "رنجِ گلشن" سے زیادہ "حسرتِ تعمیر" ہے اور وہ نئے چمن کی آشیاں بندی ہی کو اپنا مرکزِ تصوّر بنا چکے ہیں۔ ان کا ذہن و ادراک زمان و مکان کا پابند نہ ہو سکا۔ ان کی انسان دوستی، حق پرستی اور ان کی سادگی اُن کے افکار کو بہت جلد دوسری سمت موڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ دیکھئے ؎

دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے
انسانوں کو بانٹنے والو، چال تم اپنی ہار گئے

جب سے شمعِ احساس کی یہ لَو تیز ہوئی ہے آزاد کے کلام کا پیامی، افادی اور تعمیری

پہلو زیادہ واضح اور روشن ہو گیا ہے۔ وطن کی یاد اُن کے سفر میں حایل نہیں ہو جاتی بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی وطن کی یاد اُن کے سفر میں ایک INSPIRATION کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسی کے سہارے جانبِ منزل چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی آزاد نے نئے وطن کی طرف سے کبھی بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے بھی اپنا وطن سمجھ کر اپنایا اُن کے یہاں تو عام انسان دوستی ہے لیکن وطن یعنی وہ سرزمین جہاں کوئی شخص اپنی طفلی سے لے کر جوانی تک کا زمانہ گزارتا ہے زندگی بھر اس کے تصوّر سے الگ نہیں ہوتا۔ وہاں کا ذرّہ ذرّہ دامن کشاں ہوتا ہے اس کے ہزاروں ASSOCIATIONS اس سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی خلشِ غمِ منزل بن کر عمر بھر ساتھ رہتی ہے جس نے وطن کی محبّت نہ کی وہ قوم و ملک کا کب ہو سکا۔ بقولِ آزاد ؎

آدمی ہو کے بھی دنیا میں وہ انساں نہ ہُوا ننگ و ناموسِ وطن کا جو نگہباں نہ ہوا

وطن کا سیاسی تصوّر کچھ اور ہے انسانی تصوّر کچھ اور۔ آزاد کے یہاں یادِ وطن زیادہ سے زیادہ ایسی خلش کا نام ہے جو وطن اور وطن والوں کی خیر و عافیت چاہتے رہنے اور جانتے رہنے کی خلش ہے۔ اُن کے مجموعۂ کلام "بیکراں" کے پہلے صفحے پر یہی خلش ملتی ہے جو ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء نے ان کو دی ہے اور یہ خلش ماتم و فغاں نہیں، گریہ و نالہ نہیں بلکہ آگے بڑھتے ہوئے پیچھے دیکھتے رہنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ جمیل مظہری کا ایک شعر ہے ؎

یہ میرا مڑ مڑ کے دیکھ لینا بھی ہے مری شانِ رہبرانہ
قدم میں کس طرح تیز کردوں کہ میرے پیچھے ہے اک زمانہ

آزاد کے یہ اشعار بھی مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ لینے کے ذیل میں آتے ہیں اور ان سے "شانِ رہبرانہ" پر کوئی حرف نہیں آتا ؎

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ مے خانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

اسی استفہامیہ خلش کا نام آزاد کے یہاں "یادِ وطن" ہے۔ اسی ردیف کے ان اشعار میں بھی یہی کرب ہے ؎

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا
پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گزری

جدا جب اس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم
نہ پوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گزری

خموش کیوں ہیں قتیل و ندیم کچھ تو کہیں
ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیا گزری

اس خلش سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کے کلام کا خمیر خاکِ وطن سے گوندھا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات کا اتنا دردمندانہ اور شاعرانہ ردِ عمل اور اس

کثرت سے اس کا اظہار شاید ہی کہیں ملے ۔ عام طور سے اس انقلاب نے دو قسم کے احساسات ہمیں دئے ہیں ۔ لیکن دونوں احساسات کی نوعیت عام انسانوں کو تو جانے دیجئے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں بھی زیادہ تر ایک ہی رہی ہے ، یعنی سیاسی ۔ پندارِ فتح ہے تو سیاسی ، اور غم ہزیمت ہے تو سیاسی ۔ اس احساس کا انسانی اور وطنی پہلو آناد کے یہاں جا بجا ملتا ہے ۔ آزاد اس انقلاب سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں انھوں نے اس انقلاب کا جائزہ نہیں لیا بلکہ اسے خود محسوس کیا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جب کبھی اس سیاسی انقلاب کا ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے تو اس میں کبھی کوئی سیاسی اشارہ کنایہ نہیں ہوتا بلکہ ذاتی غم و حرماں کا ذکر ہوتا ہے اور اس میں بیک وقت اتنی دردمندی اور حق گوئی ہوتی ہے کہ اس سے بہتوں کی "بے بال و پری" کی نمایندگی ہو جاتی ہے اور اسی خلوص نے ان کو اس دَور کا ایک مقبول شاعر بنا دیا ہے ۔

میں نے آزاد کو ڈھاکے کے ایک مشاعرے میں پڑھتے اور پڑھتے ہوئے رُوتے بھی سنا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے بہت ساری آنکھوں کو نم کر دیا ہے ۔ اُن کے لب ولہجہ میں رقت اور فریاد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ دوسروں کے غم کو اپنے غم میں سمیٹ لیتے ہیں اور پھر اپنے غم میں ایک دنیا کو شریک کر لیتے ہیں ۔ شاعر و قاری کے رشتے کی آخری منزل یہی ہوتی ہے اور یہ منزل آزاد نے پالی ہے ۔

آزاد کی شخصیت[1] اور شاعری میں بڑی مطابقت ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے جس گفتار و کردار کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے آزاد فی الحقیقت وہی ہیں نہ کم نہ زیادہ۔ باوجودیکہ کلامِ آزاد میں ۴۷ء کے بعد ایک نمایاں رجحانِ فکر رواں دواں ہے۔ بلکتی ہوئی یادوں اور روتے ہوئے چہروں، لٹی ہوئی بہاروں اور اُجڑے ہوئے باغوں کا تذکرہ ہے۔ سُہانے خوابوں کی المناک تعبیروں کا رونا ہے۔ حسین آغاز کے دل خراش انجام کا ماتم ہے۔ ان سب کے باوجود آزاد کے یہاں مرثیہ و ماتم کی فضا کہیں نہیں ہے وہ بے اختیار کبھی بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اس سئے وئے رہنے کے انداز کے باوجود اُن کے کلام میں جو اثر آفرینی ہے وہ کہاں سے آئی۔ یہ عطیۂ خلوص ہے۔ آزاد کی شخصیت کا وہ پہلو جو اُن کی طبعی سادگی اور فطری خلوص سے عبارت ہے۔ اُن کے لب و لہجہ میں بلند آہنگی پیدا نہیں ہونے دیتا بلکہ تمام ایک قسم کا دھیما پن اور نرمی موجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے تبلیغ، نعرہ بازی یا پروپگنڈا کی ایک راہ نکل آتی ہے اور اگر آزاد چاہتے تو بے تکلف اس راہ پر نکل آسکتے تھے۔ لیکن شاید آزاد نے اس راز کو پا لیا تھا کہ وہ راہ ان کو راس نہ آئے گی۔ وہ بڑے فن کے ساتھی اور اس راہ میں اگر کچھ ہے تو شش جہات

---

[1] مجھ سے ایک بار دہلی میں آزاد کی ملاقات ہوئی تھی تقریباً آدھ گھنٹے کی (ارشد)

ہیں حدِ نظر تک بس سرخی ہی سُرخی ہے اور کچھ نہیں۔ یہ سُرخی خون ہی کی سُرخی سہی۔ آزاد شہیدوں میں خون لگا کر شامل ہونے سے رہ گئے۔ آزاد بلاشبہ ترقی پسند شاعر ہیں (حالانکہ "ترقی پسندی" سے زیادہ مہمل اصطلاح ادب میں کبھی رائج ہی نہیں ہوئی اور خدا جانے یہ کس احساسِ کمتری کے مارے ہوئے شخص کی ایجاد ہے) اُن کی شاعری کی بنیاد درد اور غم پر تو ہے لیکن یہ درد و غم انسانی اور سماجی درد و غم ہے۔ غمِ محبوب کے نقوش آزاد کی شاعری میں ہیں اور کافی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت چشمکِ برق کی ہے۔

آزاد بہ حیثیت انسان کے EXTROVERT قسم کے انسان ہیں۔ اگر وہ INTROVERT ہوتے تو آزاد اردو شعراء کی اس فہرست میں ایک اضافہ کرتے جس میں غالب و میر و فانی وغیرہ ہیں۔ اپنی زندگی میں آزاد آنے جانے ملنے ملانے والے انسان ہیں۔ کثرت سے مشاعروں میں جاتے ہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں ہیں۔ اُن کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی رفاقت اور اُن کے خلوص کے مداحین کی بھی فہرست کافی طویل ہے۔ اس لحاظ سے بھی آزاد کے یہاں ہم کو وہ المناکی و برشتگی اور غمناکی و خستگی کی شدید ترین کیفیت جو غمِ محبوب سے وابستہ ہوتی ہے تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ آزاد نے جاناں اور جہاں کی الگ الگ حیثیتیں رکھی ہیں۔ وہ "جو غم ملا سے غمِ جاناں بنا دیا" کے قائل نہیں اور ان کا محبوب جانِ جہاں ہے۔ ایک فارسی شاعر نے محبوب کے ایک خال

پر سمرقند و بخارا قربان کر دیا تھا۔ لیکن اگر آزاد کو کبھی کچھ قربان کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وہ ہرگز اس "غلط بخشی" کا ثبوت نہ دیں گے۔ ان کے یہاں وطن زیادہ پیارا ہے اور ان کے یہاں غم والم کا سارا سرمایہ وطنی، سماجی، انسانی نوعیت کا ہے۔ میں نے جتنا کچھ کہا ہے اس کی شہادت خود کلامِ آزاد دے گا۔

صدمۂ ہجر سے دل جلوہ بداماں نہ ہوا — چوٹ کھا کر بھی یہ پتھر شرر افشاں نہ ہوا

ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانا — پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گزر جا

شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں — اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ

ان اشعار کو جانے دیجیے مجموعی طور پر کلامِ آزاد کے مطالعہ کا جو تاثر قائم ہوتا ہے اور جو نقش ہمارے ذہن میں بنتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ "حریمِ ناز" ہی کے شاعر نہیں بلکہ اُن کا دردِ وطنی درد ہے۔ نظم "چاندنی رات" میں شاعر وادی کوہسار میں بیٹھا ہے اور چاند اپنی نور پاشیوں میں محو ہے۔ لیکن اس غم رُبا دل کش منظر میں چاندنی لہراتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر شاعر کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ محبوب کی خاطر نہیں بلکہ اسے تاریکیٔ وطن یاد آجاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ

گرچہ ہر شے کو حسین اور جواں دیکھتا ہوں — دل کی گہرائی میں اک سوزِ نہاں دیکھتا ہوں

دلِ غمناک میں اکثر یہ خیال آتا ہے — جس سے امید کی دنیا پہ ملال آتا ہے

کیا کبھی ہوگی نہ پُر نورشبِ تارِ وطن ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ اور شاداب نہ ہوگا کبھی گلزارِ وطن ؟

الغرض آزاد کے یہاں خارجی محرکات زیادہ ہیں لیکن چونکہ ان کے یہاں غمِ ذات نہیں بلکہ غمِ حیات ہی عمارتِ احساس کی بنیاد ہے اس لئے سارا جوش وخروش اسی طرف منتقل ہوگیا ہے۔ "جشنِ آزادی" "آزادی کے بعد" "چاندنی رات" "فریبِ نظر" اور اس نوع کی کئی نظموں میں یہی کیفیت ہے۔

آزاد ایک تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ تعلیم یافتہ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ ایم اے ہیں بلکہ یہ کہ ان کے تعمیرِ ذہن میں بڑے پاکیزہ عناصرِ علم و ادب کار فرما رہے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتیں جن کا اعتراف وہ اکثر کرتے ہیں اُن کی ذہنی رہنمائی کرتی ہیں۔ نانک، سوامی رام تیرتھ سے لے کر ٹیگور، اقبال اور دیگر اہلِ نظر کے بارے میں آزاد نے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں وہی کرب اور وہی درد اور بے چینی وطن اور اہلِ وطن کی طرف سے ہے جو اُن لوگوں کو تھی۔ آزاد فارسی شعروادب کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں جو اُن کے اردو کلام سے جا بجا نمایاں ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے قدیم ادبی اور مذہبی سرمایوں کے علاوہ مختلف فلسفے کا بھی مطالعہ کیا ہے جو ان کے بیشتر مقالوں سے ظاہر ہے اور کوئی شخص جب تمام مکتبہ ہائے فکر کا مطالعہ کر چکا ہوتا ہے اور مختلف زاویہ ہائے حیات کو دیکھ چکا ہوتا ہے۔ اور اس

کے بعد وہ کچھ کہتا ہے تو اس میں ایک خاص وزن اور اعتماد ہوتا ہے۔ آزاد کے نظریوں کے پسِ پردہ ایک مخصوص طرزِ حیات کو اجتماعی اور ملکی طور پر اپنانے کی خواہش چھپی ہوئی ہے اور ان کی یہی تمنا اُن کی شاعری ہے۔ ان کے پیشِ نظر ایک خاص تمدّن اور تہذیب کا خاکہ ہے جس کے نقوش دُھندلے ہو چکے ہیں اور ان کی شاعری تمدّن کے چہرے سے اس گرد کو صاف کرنے کی کاوش ہے لیکن ع

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز

اگر وہ انقلاب نہ آیا ہوتا جس نے آزاد کے دل و دماغ کی بنیادیں ہلا دیں اور انھیں بار بار یہ کہنے پر مجبور کیا ؎

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفاں گئے
زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد

لیکن اے آرزوئے دید ذرا غور سے دیکھ
کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو
سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گزری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گزری

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

تو مجھے یقین ہے کہ آزاد کی شاعری ہزیمت و پسپائی کے اعلان و اعتراف سے قطعی الگ

ایک چیز ہوتی جو بڑی حد تک کسی مخصوص فلسفۂ حیات کی بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کرتی لیکن شاعر جب "امن دوستی" جس "انسانیت پرستی" اور جب "حب الوطنی" کے پیمانے میکدۂ حیات میں سجاتا رہا اس میکدے میں ایک طوفانِ بہار آگیا اور خود بقولِ آزاد ساغر و مینا ٹکرانے لگے، اس دھچکے نے آزاد کی راہِ فکر میں بیک وقت ایک انجماد اور ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ انجماد اس طرح کہ اُن کے یہاں تکرار کو بہت دخل ہو گیا اور اضطراب ..یوں کہ اُن کے فن میں اور بھی چبھن آگئی۔

آزاد کی راہِ شاعری کی ایک مخصوص منزل ہے۔ لیکن یہ منزل کوئی سیاسی یا ہنگامی منزل نہیں۔ نہ انقلاب لانے کی تبلیغ ہے نہ ثواب کمانے کی تحریک۔ یہ منزل انسانیت پرستی ہے اور بلاشبہ اپنی شاعری سے آزاد ایک ایسے نظامِ حیات کی ہمارے ذہن میں فضا تعمیر کر رہے ہیں جو بہت ہی صحت مند اور جاندار ہے اور وہ کسی "ازم" (ISM) سے متاثر نہیں۔

آزاد کی شاعری کے دیگر پہلوؤں پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی شاعری کا مرکز و محور اور ہوا و فضا وہی ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ پھر بھی اُن کی شاعری کے دوسرے رُخ کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔ شاعر اپنی زندگی میں مختلف زندگیاں جیتا ہے۔ اس کا دل تو جامِ جہاں نما ہوتا ہے اور اس جام میں سب

سے پہلے جو جلوے بے حجاب ہوتے ہیں وہ عروسِ فطرت کے جلوے ہوتے ہیں۔ شاعرِ مشرق اقبال کی پہلی حیثیت "فطرت کے پجاری" ہی کی تھی ــــــــــــ

جب احساس اور شعور میں بالیدگی شروع ہوتی ہے تو شاعر کا حُسن پسند دل پہلے شاعر کو کوہسار و سبزہ زار کی طرف لے جاتا ہے اور فطرت کے تمام رازہائے سربستہ اُس پر منکشف کرتا ہے۔ حسنِ فطرت، پاکیزگیٔ فضا کے پے در پے اثرات شاعر کے دل و دماغ پر ثبت ہوتے رہتے ہیں اور پھر وہ عشق و پاکیزگی کی تمام ستھری اور نکھری ہوئی علامتوں کو زندگی میں تلاش کرنے لگتا ہے اور نہیں پاتا ہے تو اس کی حسن پسند طبیعت ایک حسین و پاکیزہ فضا کی تعمیر میں لگ جاتی ہے۔ ہر حساس اور فطری شاعر کے اوّلیں خواب آغوشِ فطرت میں پرورش پاتے ہیں۔ آزاد کے یہاں بھی منظر نگاری کے بڑے دل نواز نمونے ہیں۔ ان میں مشاہدے کے خلوص کے ساتھ ہی ساتھ حسّی بیداری بھی پائی جاتی ہے۔ ایک رباعی ہے:

احساس میں لو دمک رہی ہے گویا ۔۔۔ پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں ۔۔۔ شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

اور اب "کنارِ راوی" دیکھیے

یہ وقتِ شام، یہ آبِ رواں یہ تنہائی ۔۔۔ سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی
فضا میں تین طرف سے ہجومِ ظلمت کا ۔۔۔ اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی

کبھی وہ چشم زدن میں شفق کی شمعِ حیات فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی

وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب زمین کا حسن بڑھانے کو چاندنی آئی

دیکھا آپ نے کہ ان چار اشعار میں کس غضب کی مصوّری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ ابھی ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

آزاد کی غزلوں میں فکر ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ ہے اس طرح کہ اُن کے یہاں دردِ دل اور آہِ سوزاں کے علاوہ اور بہت کچھ ہے جو ذاتی زندگی اور اس کی حرماں نصیبوں سے مختلف ہے اور نہیں اس طرح ہے کہ اُن کے یہاں فکر نے نہ تو فلسفے کا "روکھا پن" پیدا کیا ہے اور نہ وہاں شانِ تبلیغ ہے۔ آزاد غزل کو "غمِ محبوب" نہیں سمجھتے ہر قسم کے جذبات واحساسات کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن زبان، مزاج اور لب ولہجہ غزل ہی کا ہوتا ہے۔ میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ہر وہ خیال جو احساس کو چھوتا ہوا گزرے، غزل کا سرمایہ ہے۔ چنانچہ ہیروشما کی سرزمین کی ویرانیاں اور عاشق کے دل کی محرومیاں بھی موضوعِ غزل بن سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ غزل کو بطور غزل برتا جائے۔

گلستاں کو دیکھ آئی، کہکشاں سے ہو آئی، آسماں کو چھو آئی

اے نگارِ ناپیدا! اب تری تمنا میں آرزو کہاں پہونچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلہ مجھ کو تم سے کیا ملا مجھ کو

میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مسکرا اُٹھی تم جہاں جہاں پہنچے

تہذیب کہہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

اک بے وفا کی نذر کروں پھر وقارِ عشق
کیا آرزو ہے جس پہ مٹا جا رہا ہوں میں

غمِ دوراں کی ہوائیں تھیں بہت تیز مگر
ترا شعلۂ غمِ جاناں کبھی مدھم نہ ہوا

کچھ دید کے قابل ہے جہاں میں تو یہی ہے
اے دیدۂ دل بے رُخیٔ اہلِ جہاں دیکھ

یہ فریبِ رنگ و بُو کچھ دیر رہنا چاہیئے
ورنہ توہینِ مذاقِ دید کا ساماں نہ کر

اے حُسنِ بے نیاز نہ کر دلبری پہ ناز
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنّا ہی اور ہے

واقف ہے جن کی آنکھ مآلِ بہار سے
اُن کے لئے چمن کا تماشا ہی اور ہے

پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

خوابیدہ مری روح میں اے نغمۂ خاموش
تو دیکھ کہ میں گوش بر آواز ہوں کب سے

تاروں کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والے
تھامے ہوئے میں دل میں ترا راز ہوں کب سے

بس اتنی روداد سُنی ہے روٹھ کے اٹھنے والوں کی

آگ بھرے دل سے روٹھے با دیدۂ پُر نم ایک ہوئے

ان آئینوں میں نگارِ حیات کی مختلف ادائیں ہیں جن کو شاعر نے بڑی فن کاری سے الفاظ میں محفوظ کر دیا ہے۔ غزل میں لب و لہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ آزاد کی غزلوں میں خیال اور احساس دونوں کی جلوہ پاشیاں ہیں۔

لیکن ایک بات ہے۔ آزاد "پُرگوئی" کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور مجھے اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں وہ "او" ان کا کلام شعر سے زیادہ تبرک نہ بن جائے۔ ادھر کئی غزلیں آزاد کی ایسی ملی ہیں جن میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آزاد نے اپنی "موزونیٔ طبع" کا ثبوت دیا ہے۔ "موزونیٔ طبیعت" کے ساتھ اور کچھ نہ ہو "زورِ بیاں" تو ہو لیکن اگر وہ بھی نہ ہو تو سکوت بہتر ہے۔ آزاد کی کئی غزلیں جو "بیکراں" کے بعد رسالوں میں میری نظر سے گزری ہیں وہ محض فرمایشی معلوم ہوتی ہیں۔ پُرگوئی کا ایک بُرا اثر فن پر بھی پڑتا ہے۔

کم کہنے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آزاد اپنے جذبات و احساسات کو زیادہ دیر تک اپنے دل میں "پال" سکتے ہیں اور احساس جب تک دل و دماغ کی تمام گرہیں نہ کھول دے یا خیال جب تک ساز کے تمام تاروں کو شدّت سے جھنجھنا نہ دے نغمہ "سودائے خام" رہتا ہے اور یوں بھی جب تک "بادۂ دل سم نہ بن جائے" مے نوشوں کو نہ سرور آتا ہے نہ خمار ؛

ماہنامہ "نگار" لکھنؤ

اپریل ۱۹۵۵ء

تصانیف

بیکراں



دہلی کالج کی ایک شام

سردار جعفری۔ خواجہ احمد فاروقی۔ خورشید الاسلام۔ گوپی ناتھ امن

آل احمد سرور۔ جگن ناتھ آزاد۔ خواجہ غلام السیدین۔ ایم۔ ایم بیگ۔ ثریا سلطانہ۔ احتشام حسین۔ ڈاکٹر عبدالعلیم

"بیکراں" پر ایک نظر

خواجہ احمد عباس

جو لوگ کہتے ہیں۔ "اُردو زبان ہندوستان میں مر چکی اب اُس کی فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے۔" ان سے میں کہوں گا کہ "جگن ناتھ آزاد جیسے نوجوان شاعروں کی نئی نظمیں پڑھیئے۔ جس زبان کا آپ جنازہ نکالنے کی فکر میں ہیں اُس میں ابھی بہت جان باقی ہے۔"

جو لوگ کہتے ہیں۔ "غزل کا میدان پامال اور فرسودہ ہو چکا۔ غزل نئے خیالات کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔" اُن سے میں کہوں گا۔ "جگن ناتھ آزاد کے نئے مجموعے "بیکراں" کی غزلیں پڑھیئے اور پھر فیصلہ کیجیئے۔ . .

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بے گانوں کا افسانہ ہُوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گذری

کاش ہمارے رہنما آزاد کے ان معنی خیز سوالوں کا جواب دینے کی تکلیف گوارا فرماتے۔

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

جب مرغِ خوش الحاں دام و قفس انعام ہو خوش الحانی کا
پھر نغمہ سرا گلزار میں تو اے مرغِ خوش الحاں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دُھندلا یا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

"فراری" ادیب اور بیمار ذہنیت کے مفکّر آزاد کے ان دو شعروں کو پڑھیں۔

یہ گلشنِ نو ہے گلشن تو اے فکرِ کہن کے دیوانو!
بیمار تفکّر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

اے بھاگنے والے وقت ہے یہ ہاں صحنِ چمن سے بھاگ نکل
جب باغ قفس بن جائے گا اُس وقت گریزاں کیا ہوگا

ہندوستان اور پاکستان کے فسادات اور تبادلۂ آبادی کے بارے میں

متعدد ادیبوں اور شاعروں نے قلم اُٹھایا ہے ۔ مگر آزاد کی "نئی محفل" میں جس کا جنم تقسیم ہند کے بعد بیک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوا ایک منفرد شان، ایک عجیب تلخی اور معنی خیز اشاریت ہے جو یاسیت کے بجائے فکر اور محاسبۂ نفس کی طرف لے جاتی ہے :

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا — نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا
چمن بدلا، چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے — یہاں اب ہم پُرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں — وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا

تو گہری نیند میں ہے جاگنا آساں نہیں تیرا — ہم اے مردے ترے شانے ہلائیں بھی تو کیا ہوگا

اور آزادی کے بعد ملک اور قوم پر جو بیتی اور جو گزر رہی ہے اُس کے بارے میں آزاد عوام کے ترجمان ہیں

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے — زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دید ذرا غور سے دیکھ — کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے اور پکار اُٹھتا ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے
آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی دیدۂ دل بہ ہمہ سو نگراں آج بھی ہے

پھر بھی آزاد مایوس نہیں ہے۔ اُس کے اشعار میں امید کی شمع جلتی نظر آتی ہے کیونکہ آزاد کو عوامی قوتوں اور انسانیت میں اعتماد ہے:

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں مری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

جگن ناتھ آزاد شاعر ہے، اس کا انداز بیان حسین اور شاعرانہ ہے۔ وہ اپنے اشعار میں گھٹیا پروپگنڈائی نعرے نہیں بلند کرتا، اس کے رومانی اشعار میں فراریت نہیں ہوتی اور نہ وہ کبھی سیاسی ضرورت سے شعر کا گلا گھونٹتا ہے مگر اس کا سیاسی شعور بہت گہرا ہے، اس کی نظر بڑی دُور رس ہے۔ سامراج اور سرمایہ داری کی فریب کاری کا پردہ جس خوبی اور لطافت سے اس نے چاک کیا ہے، شاید ہی کسی دوسرے اشتراکی شاعر نے کیا ہو

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست چور گلشن سے اگر پھول چُرا لیتے ہیں
حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجّب تو نہیں راہ زن قافلے والوں کو اڑا لیتے ہیں

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں

دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضوِ انجمِ تاباں سے چرا لے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول میں خوشبو نہ رہے

حرص کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں
تیرا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

مجھے آزاد کی غزلوں اور نظموں میں سب سے بڑی بات یہی نظر آئی کہ ان میں معنی اور حسنِ بیاں، انقلابی جوش اور شاعرانہ اشاریت، فن اور مقصد کا لطیف امتزاج ہے۔ وہ شعر کی عظمت اور قوّت سے واقف ہے اور اسی لئے وہ انقلابی نعرے بلند کئے بغیر عوام کے شعور کو انقلاب کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ چیختا نہیں، اشارہ کرتا ہے۔ پھاوڑے کی بجائے نشتر سے کام لیتا ہے۔ مگر کتنا تیز ہے اس کا نشتر۔ اُس کی ترقّی پسندی اوپری نہیں، گہری اور خوبصورت ہے۔ اس لئے اُسے اپنے اشعار میں ترقّی پسندی کا اشتہار دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے شعور میں سیاسی شعور اور فن کارانہ حس دونوں موجود ہیں اور ان کے اشتراک سے وہ اپنے اشعار تخلیق کرتا ہے۔ اُسے اپنی شاعری اور ترقّی پسندی دونوں میں پورا بھروسہ ہے وہ "تمام زندگی" کا ترجمان اور رازداں ہے — نہ صرف عشق و محبّت کا اور نہ صرف سیاست کا۔ اُسے اپنے اُبھرتے ہوئے فن کے مقصد اور سمت دونوں کا علم ہے۔

بہبودِ بشر کے یہ اگر کام نہ آئی — کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوانی

اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب — افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

آزاد انساں سے مخاطب ہے اس کی آواز انسانیت کی آواز ہے۔ اسے انسان کو سننا ہی پڑے گا۔

ماہنامہ "شاہراہ" دہلی

بیکراں

مخمور جالندھری

آزاد اُس دور کا شاعر ہے جب اردو میں ترقّی پسند تحریک نے جنم لیا تھا۔ جب فرسودہ روایات ٹوٹ رہی تھیں۔ جب پرانے خیالات دم توڑ رہے تھے۔ جب اُردو شاعری میں تجربہ اور مشاہدہ پہلی مرتبہ اپنے حقیقی رنگ میں اُبھر رہا تھا۔ جب حقیقت پسندی اپنے تیکھے پن کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی تھی ترقی پسندی کی تحریک نے زندگی کے چہرے پر سے نقاب اُٹھا دیا تھا۔ زندگی اپنے تمام گھناؤنے پن کے ساتھ شاعروں کے سامنے ننگی کھڑی کر دی گئی تھی اور چیخ رہی تھی کہ وہ اسے ہی اپنی نگارشات کا موضوع بنائیں۔ کیونکہ وہی تو ادب کی خالق تھی۔ اُس وقت جن جیالے فن کاروں نے زندگی کی اس پکار کو سُنا اُن میں آزاد بھی تھا۔

آزاد نے اپنی شاعری کی ابتدا دوسرے بیشتر شعراء کی طرح غزل سے کی۔ غزل میں ابھی نیا پن نہیں آیا تھا۔ وہی گھسے پٹے خیالات بار بار غزل کے سانچے میں ڈھالے جا رہے تھے۔ قافیوں کی مناسبت سے وہی پرانے خیالات دُہرائے جا رہے تھے۔ اگر کوئی نئی زمین بھی تلاش کی جاتی تو اس میں بھی ہیر پھیر کے ساتھ وہی پرانی بات کہی جاتی۔ کہیں کہیں ایسا شعر بھی آ جاتا جو بظاہر نیا معلوم ہوتا لیکن جب اس شعر کو بھی کھنگالا جاتا تو وہ پرانا ہی نکلتا۔ نئے شاعر کچھ سمجھدار واقع ہوئے تھے انھوں نے غزل کی طرف بہت کم توجہ دی۔ لیکن ان میں چند شاعر ایسے بھی تھے جو غزل کے چٹیلے پن سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ بضد رہے کہ غزل کا دامن تنگ نہیں اور اس میں نئی گلکاری کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کی یہ ضد جب تک ثبوت بہم نہ پہنچاتی تب تک کوئی اس نظریے کو کیونکر تسلیم کر سکتا تھا۔

جن دنوں غزل کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی ان دنوں نئے انداز میں نظمیں بھی کہی جا رہی تھیں۔ ان نظموں کا پیرہن یعنی ہیئت بالکل مختلف تھی۔ اب نظموں میں "جواب مضمون" کی سی کیفیت نہیں رہی تھی۔ نظموں کے ذریعے نہایت گہرے خیالات منظرِ عام پر آنے لگے۔ ان نظموں کا اثر غزل پر بھی پڑا۔ اور غزل کا پرانا سانچہ واقعی بدل گیا۔ پڑھے لکھے شاعر جو مغربی ادب کا مطالعہ کر رہے تھے

غزل میں بھی خوبصورتی کے ساتھ نئے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ غزل میں بھی اتنی قبولیت ہے کہ اُس میں ہر رنگ کے مضامین سما سکیں۔ اور بہت سے شعراء نے اپنی شاعری کو غزل تک محدود کر دیا۔

آزاد کے بارے میں بھی ادبی حلقوں میں یہی خیال کیا جاتا رہا کہ وہ غزل ہی کو اپنے خیالات کی جولاں گاہ بنائیں گے۔ آزاد نے ان دنوں نہایت اچھی غزلیں کہیں۔ ان کی غزلوں کی خوبی یہی تھی کہ وہ اپنی غزلوں میں پُرانے خیالات سے دامن بچاتے تھے۔ روزمرہ اور زبان کے چٹخارے کے علاوہ گہرے خیالات بھی پیش کرتے تھے۔ نظم کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ دی تھی مغربی ادب سے بحدِّ کافی روشناس ہونے کی بدولت انھوں نے محسوس کیا کہ غزل اُن کے خیالات کی فراوانی کا اتنا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتی جتنی کہ نظم اس غرض کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ انھوں نے نظم کی طرف بھی توجہ کی۔ غزل گوئی نے ان کی زبان اور اُن کے اظہارِ بیان میں گھلاوٹ اور سلجھاؤ پیدا کر دیا تھا۔ غزل کی چند ایک خوبیاں تھیں یعنی الفاظ کی چُستی، کم سے کم الفاظ میں مطلب کا اظہار، وہ خوبیاں اُن کی نظموں میں بھی کارفرما دکھائی دیں۔

آزاد ان دنوں اپنے ساتھیوں کی نظموں سے بے حد متاثر رہے۔ ان کی

اس دَور کی نظموں میں وہی رنگ ملتا ہے جو اردو ادب میں بہت عام ہو گیا تھا ترقّی پسندی جو مقصد لے کر آئی تھی اُسے بہت سے نئے لکھنے والوں نے اُلجھا دیا تھا۔ ادب کی ہر صنف بالخصوص افسانہ اور نظم میں گو زندگی اور زندگی کے مسائل در آئے تھے لیکن ان میں اس زندگی کا پرتو بہت کم تھا جس کے حصول کے لئے آج تمام انسانیت لڑ رہی ہے۔ زندگی کے ڈھکے چھپے پہلوؤں کو ننگا کر دینا ہی ترقّی پسندی سمجھا جانے لگا۔ تجزیہ کیا جاتا لیکن نہایت ہی غیر صحت مندانہ۔ جدّت ۔ روایات کو اندھا دُھند توڑنے کا جنوں ۔۔ غیر ضروری ابہام سے رغبت۔ دُور کی کوڑی لانے والی انسانیت سے لگاؤ۔۔۔ فرائڈ کے جنسی مسائل، کی تبلیغ ۔۔۔ سیاست سے پہلو تہی ۔۔۔۔۔ ان تمام باتوں کو ترقّی پسندی کا نام دیا جانے لگا۔ یہ ایک غلط رو تھی جو تیزی کے ساتھ چل نکلی تھی اور یہ وبا کی طرح ترقّی پسند صفوں میں کافی عرصے تک پھیلی رہی۔

آزاد کی بیشتر ابتدائی نظمیں بھی اسی وبا کا نتیجہ ہیں۔ ان میں ابہام بھی ہے، مایوسی، بے حوصلگی اور قنوطیت بھی ہے۔ ایسی داخلیت بھی ہے جو صرف شاعر کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔ فرار بھی ہے جو آج کسی حال میں بھی

مستحسن نہیں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں میں یہ بدعت اس لئے پھیلی کہ انھوں نے ادب اور سیاست کو دو مختلف چیزیں تصور کیا۔ یعنی وہ زندگی کے فن کار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے فن کار نہ رہے۔ زندگی پہ سب سے گہرا تو سیاست کا اثر ہوتا ہے۔ ایک خاص طبقے کی سیاست نے انسان کی زندگی کو آج تک ہراساں اور خوف زدہ رکھا ہے ——

سیاسی ناپختگی کی بدولت ہی شاعر اور ادیب قومی انقلاب کا ساتھ دیتے رہے۔ اور جب قومی انقلاب کو فتح ہوئی اور عوام کی حالت وہی رہی تو شاعر اور ادیب چونکے۔ بدیسی دشمن کا پھیلایا ہوا جال ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اُس سے ملتا جلتا جال اب اپنے ہی رہنما بُن رہے تھے۔ آقا بدل گئے تھے لیکن وہی ایک خاص طبقے کی مخصوص سیاست ابھی تک نہیں بدلی تھی۔ اس مخصوص طبقے کی سیاست آج بھی انسانیت کو اپنے پاؤں تلے روند رہی ہے جب شاعروں اور ادیبوں پر یہ حقیقت عیاں ہوئی تو ترقّی پسندی بھی نکھرنے لگی۔ اس وقت وہ ادیب جو صحیح معنوں میں ترقّی پسند تھے۔ جو ایک خاص مقصد کے لئے قلمی جنگ لڑ رہے تھے متاسف ہوئے —— اور وہ فوراً اس موڑ کی طرف پلٹے جو اُن کا صحیح مقام تھا۔ اور جو ادیب محض جدّت پسندی کا سہارا لئے ہوئے ترقّی پسندوں کی صفوں میں بڑھتے آ رہے تھے، پیچھے ہٹ گئے۔ اور وہ اپنے اُس موڑ کی طرف لوٹ گئے جو اُن کا صحیح مقام تھا۔

آزاد کی پرانی نظموں کے قطع نظر ہمیں ان کی نئی نظموں میں ترقی پسندانہ شعور کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی غزلیں بھی وہی رنگ اختیار کر رہی ہیں۔ جو ایک ترقی پسند شاعر کے کلام کا ہوتا ہے۔ ان کی نئی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے وہی راستہ چن چکے ہیں جس پر ہر سمجھدار ادیب آج چل رہا ہے۔ کیونکہ سچے ادیب کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے —— انسان دوستی کا راستہ —— ہر بالغ نظر ادیب اس نظام کے قیام کو قریب لانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے جس میں انسانیت خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کرے گی اور اس پر کسی بدعت کا دباؤ نہیں ہوگا۔

آزاد کا یہ نیا پلٹا ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ آگے چل کر کامیابی کن لوگوں کی ہوگی۔ اُن انسانوں کی جو ایٹم بم سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ جن کی طاقت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ جن کی اُٹھان اور جن کے ارتقاء میں سونے کے پرستار اپنی بہیمانہ یلغار کے باوجود حائل نہیں ہو سکتے۔

آزاد نے اپنے ہی نہیں پوری انسانیت کے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ انہوں نے اس دشمن کو آپ ہی نہیں دیکھا اوروں کو بھی دکھایا ہے۔ وہ خود فریب کھانے سے بچے ہیں۔ دوسروں کو بھی اس فریب سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا   بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گذری

لہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا　　　خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری

(۱۵- اگست ۱۹۴۷ء)

یہ دو سوال آزاد ہی نے نہیں کئے بلکہ یہی سوال تمام انسانیت پوچھ رہی ہے۔ اور وہ حلقے خاموش ہیں جنہوں نے خزاں کے روپ میں ہمیں بہار بخشی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم اس نچوڑی ہوئی بہار کو لے کر خوش ہو جائیں گے اور چُپ رہیں گے لیکن آج وہ حلقے گریبان میں مُنہ ڈالے ہوئے سرنگوں ہیں۔ ان کی ریا کاری کا راز طشت از بام ہو رہا ہے۔

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے
خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے
خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی
خوشی کے ایک بحرِ بیکراں میں ڈوب جائے گی
خبر نہ تھی کہ وہ سحر نظر کو جس کا شوق ہے
قریب و دُور پُر مہیب رات بن کے چھائے گی

یہ وہ بہار تھی جس کا ڈھنڈورا بڑی شد و مد کے ساتھ پیٹا گیا تھا۔ اور یہ اس بہار

کا حسرت ناک انجام تھا جو آزاد نے دیکھا اور ہم سب نے دیکھا۔ یہ بہار نہیں تھی کیونکہ گلستاں ابھی تک ایک قفس ہے۔ اس قفس کی سلاخوں کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ قفس کی ان سلاخوں پر ضربِ کاری لگانے والوں میں سے آزاد بھی ہے۔

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا　　آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

یہ سوال پوچھنے کے بعد آزاد یقین کے ساتھ کہتا ہے

اے بھاگنے والے وقت ہے یہ ہاں صحنِ چمن سے بھاگ نکل

جب باغ قفس بن جائے گا اس وقت گریزاں کیا ہوگا

(ایک غزل)

آزاد نے اس شعر میں فرار کی تعلیم نہیں دی۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ گلستاں بڑی خوبصورتی کے ساتھ قفس میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ وہ گلستاں کے پھولوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں، قبل اس کے کہ گلستاں قفس بن جائے وہ اُٹھے اور اس روح فرسا حادثے کو وقوع پذیر ہونے سے روک دے۔ اور آزاد کا یہی عزم ایک اور نظم میں بھی دکھائی دیتا ہے ؎

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفاں گئے　　زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد

لیکن اے آرزوئے دید ذرا غور سے دیکھ　　کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور

تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں مری مجبتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

ہاں — اور یہ قندیل یونہی جلتی رہے گی۔ مقتدر طبقہ چاہے کتنے ہی طوفان کیوں نہ اُٹھائے۔ کچلی ہوئی انسانیت نے جو دیا اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا ہے وہ اسے کبھی نہیں بجھنے دے گی۔ کیونکہ اب اسے اپنی طاقت کا علم ہو چکا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو — طاقت کا سرچشمہ یہی کچلی ہوئی انسانیت ہے۔ جو اب ایک لمحہ کے لئے زرپرست طبقہ کے پاؤں تلے مسلے جانے کے لئے تیار نہیں۔

ظلمتِ شب کی قسم پُرپیچ راہوں کی قسم

ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمّتِ مردانہ ہم

(غزل)

چند گنے چنے افراد کے لئے تمام نسلِ آدم تباہی کے غار میں نہیں جھونکی جا سکتی۔ ایک شخص کی آسائش کی خاطر دس آدمی بھوکے نہیں رہ سکتے۔ آسائش اور محنت کے ثمرے پر اُسی شخص کو حق حاصل ہے جو خود محنت کرتا ہے۔ جو خون پسینہ ایک کر کے مٹی کو سونا بناتا ہے۔ جو لوہے کی گراںڈیل کلوں کو جھنجھوڑ کر آسائش و راحت کے اسباب پیدا کرتا ہے۔

رنگ محفل کا بدلتا منظر آتا ہی نہیں

ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

(آزادی کے بعد)

جس طبقے نے یہ اندر سبھا سجا رکھی ہے یہ رقص و سرود کی محفل لگا رکھی ہے۔

اُسے اس محفل سے اُٹھ کر جانا ہوگا۔ کیونکہ

پلانے والے خبر بھی ہے پستی و بلندی روا ہو جس میں

یہ پینے والوں کے ہیں ارادے وہ میکدہ لوٹنا پڑے گا

(ایک غزل)

ہاں۔ اب میکدہ لٹ کر رہے گا۔ یہ آزاد کی آواز نہیں اس وقت تمام

انسانیت کی آواز ہے۔

جالندھر دسمبر ۱۹۴۷ء

مطبوعہ "ادب" کراچی

کلکتے کی ایک محفل
مشاعرے کے بعد



پروفیسر ہیرالال چوپڑہ معتمد مشاعرہ: مخمور دہلوی۔ جوش ملیح آبادی۔ جگن ناتھ آزاد۔ فراق گورکھپوری۔ سرور تونسوی

جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام

حامد علی خاں

اُردو کے نامور شاعر جگن ناتھ آزاد کا تازہ مجموعۂ کلام دہلی میں زیرِ طبع ہے۔ اشاعت سے قبل انہوں نے اس مجموعے کے اجزاء مطالعے کے لئے ہمیں مرحمت فرمائے ہیں۔ مگر ہمیں مناسب معلوم ہُوا کہ اس مطالعے میں ہم قارئینِ مخزن کو بھی شریک کر لیں۔ ان سطور کا مقصد نہ تنقید ہے نہ تعارف۔ کیونکہ اردو کے کہنہ مشق شاعر اور مخزن کے قدیم کرم فرما حضرتِ محروم مدظلہٗ کے فرزندِ ارجمند جگن ناتھ آزاد اردو ادب کے شناساؤں کے لئے کچھ اجنبی نہیں اور خود قارئینِ "مخزن" ان صفحات میں اس سے قبل بھی اُن کے بلند پایہ منظومات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس لئے یہ صفحات آپ کو کسی نئے شاعر سے نہیں بلکہ محض ایک نئے مجموعۂ کلام سے روشناس کریں گے۔

اس مجموعے کی افتتاحی غزل تو وہی ہے جو ۱۵۔اگست ۱۹۴۷ء کے عنوان سے "مخزن" میں بھی چھپ چکی ہے:-

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری

لیکن اس کے علاوہ بھی جو نظمیں اور غزلیں اس مجموعے میں ہیں اُن میں جا بجا ہنگامۂ ۱۹۴۷ء کے تاثرات ملتے ہیں۔

آزاد کا مولد و منشا پاکستان ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو طوفانِ بے تمیزی برپا کیا گیا وہ ان کو بھی لاکھوں دوسرے ہندوؤں مسلمانوں کی طرح اپنے وطنِ مالوف سے اُٹھا کر ایک دوسری سرزمین میں لے گیا۔ آزاد کے ذکی الحس دل نے وطن کی جُدائی کو قدرتاً بہت محسوس کیا ہے اور اُن کے کلام میں اب بیشتر اُسی آزادی کا ماتم نظر آتا ہے۔ جس کے انتظار میں انہوں نے اپنی نوجوانی کے سیکڑوں مضطرب روز و شب گزارے تھے۔ صبحِ آزادی طلوع ہو چکی ہے۔ لیکن غریب الوطن شاعر نوحہ خوانی پر مجبور ہے:-

خیال تھا کہ صبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اک بلند و پست پر نشاط بن کے چھائے گی

قریب و دُور تک ردائے نور پھیل جائے گی
فلک بھی مسکرائے گا، زمیں بھی مسکرائے گی

پکھ اپنا رنگ اس طرح یہ صبحِ نو جمائے گی

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے　　خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے　　خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی
خوشی کے ایک بحرِ بیکراں میں ڈوب جائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے　　بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے　　جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

آزاد کے لئے غریب الوطنی کا درد اس وجہ سے اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ سرزمینِ پاکستان سے محض ان کا مادّی تعلّق ہی نہیں، روحانی تعلّق بھی ہے۔ وہ اُسی تہذیب و تمدّن سے وابستہ ہیں جسے ہند سے جلاوطن کر کے اب پاکستان تک محدود کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آزاد کی زبان، اُن کی ادبی روایات، اُن کی طرزِ فکر، اُن کے پسندیدہ ادباء و شعرا، سب کے سب اب صرف پاکستان کو سونپے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنی محبوب زبان اُردو کے متعلق یہ پُر اُمید شعر کہا تھا ؎

نکہتیں یہ کہتی ہیں، لالہ زارِ اُردو میں پھر بہار پیدا ہے
حیف باغبانوں پر! اس چمن میں اے آزادؔ اب اگر خزاں پہنچے

آزاد کی اس امید کا یہ حشر ہُوا کہ اگرچہ وہ خود یوں تو اردو کے گھر (دہلی) جا پہنچے۔ لیکن اردو وہاں سے مہاجر بنا کر نکال دی گئی اور نیا وطن اُن کے لئے بالکل اجنبی بن کر رہ گیا۔ اس حالت میں نئے وطن سے کوئی سمجھوتہ کرنا اُن کے لئے اور زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ ایک ناکام کوشش کے بعد بے اختیار اُن کی زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

نئے وطن میں انہیں کوئی پرانا محرم نہیں ملتا ؎

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے
یہاں اب ہم پُرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

نئے وطن میں اُن کے خونِ جگر کے لعل و گہر کے قدرداں مفقود ہو چکے ہیں ؎

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو
نوادر ہم وہاں جا کر لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

خرد دشمن جہالت آفریں ماحول میں اے دل
ترانے ہم تمدن کے جو گائیں بھی تو کیا ہوگا

جنہیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت
ہم اب تارے فلک کے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا

تجلّی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی
اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

اس مایوسی میں انہیں پُرانے وطن کی یاد ستاتی ہے اور وہ دردآمیز حیرت

سے سوچتے ہیں کہ فراقِ وطن میں جب میرا یہ حال ہے تو میرے بغیر میرے وطن کی بہار کا کیا حال ہُوا ہوگا ؎

کس طرح کر سکوگے بہاروں کو مطمئن — اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آسکوں

پھر اپنی بے کسی اور مجبوری پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور اہلِ وطن کو یاد کر کے رہ جاتے ہیں ؎

اس بزم میں جہاں نہ علم ہے نہ فن ہے تنقیح — میرا قصور کیا جو ترانے نہ گا سکوں

ہم نے ابھی کہا تھا کہ آزاد کا روحانی تعلق اُسی تہذیب و تمدن اور انہیں ادبی روایات سے ہے جو اب صرف پاکستان کا حصّہ سمجھی جاتی ہیں۔ آزاد کے متعلق ہمارے اس قول کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت علامہ اقبال رح سے آزاد کی بے پناہ عقیدت سے ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

وہ حق شناس فلسفی و مردِ نکتہ داں — وہ باکمال شاعرِ درویش پاکباز

نغمے تھے جس سخنورِ عالی دماغ کے — مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز

اقبال اے جہانِ معانی کے تاجدار — اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار

تو نے سخن کو زندہ جاوید کر دیا — تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا — تو روح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا

اس دور میں تو آگہ رازِ قدیم تھا | جو ہو حریفِ جلوۂ حق وہ کلیم تھا

"آزاد و اقبال" کے عنوان سے اُن کے چند شعر اور اس مجموعے میں دیکھئے وہ علامہ اقبال کو اپنا روحانی رہنما بھی تسلیم کرتے ہیں۔ شعر یہ ہیں:-

آزاد:- ذلیل و خوار ہیں اہلِ ہنر کیوں
جہاں نا قدر داں ہے اس قدر کیوں
جو کوسوں دور ہیں علم و ہنر سے
وہی ہیں صاحبِ لعل و گہر کیوں

اقبال: قماشِ نقرہ و لعل و گہر چیست
غلامِ خوش گِل و زرّیں کمر چیست
بہ جو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست

آزادی کے بعد آزاد نے جس درد و غم کا اظہار کیا ہے اس کے اسبابِ ظاہر

ہیں۔ پھر اُن کے درد و غم میں ایک پاکیزگی اور خلوص بھی ہے۔ لیکن ہمیں آگاہ رہنا چاہیئے کہ آزادی کے بعد بعض نفاق انگیز لوگوں نے بلاوجہ بھی بے قراری اور زار نالی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اگر گمراہ لوگوں سے شرمناک جرائم سرزد ہوئے ہیں تو اس میں آزادی پر یا آزادی کے لئے جہاد کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں آتا۔ نہ محض نالہ و ماتم کی صدائیں بلند کر کے ہمارے ادباء اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ادباء کا فرض تو یہ ہے کہ وہ عام انسانوں کے لئے مشعلِ ہدایت بن کر انھیں اعلیٰ انسانیت اور بہتر مستقبل کی طرف لے جائیں۔ خود آزاد کو ایسے گمراہ کن شعر و ادب کے کھوکھلے پن کا احساس ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

فانی ہیں جو افکار ترے تو بھی ہے فانی
افکار سے انساں کی بقا بھی ہے فنا بھی

وہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی
جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو

فی الحقیقت اب ہمیں "مرثیہ خوانی" کے ہنگامے کو اور طول نہ دینا چاہیئے شعراء اور ادباء کو لازم ہے کہ وہ عوام کے مضطرب جذبات کو تسکین دے کر انھیں بہتر زندگی کی تعمیر کی طرف مائل کریں۔ جن لوگوں کے دل میں انگریز نے متحدہ ہند کا شہنشاہانہ تصوّر پیدا کر کے انھیں ناحق نعل در آتش کر دیا تھا۔ انھیں بھی عدل و انصاف کے تقاضوں سے آگاہ کر کے اُن کے جذبات کو آسودہ کرنا ضروری ہے

اُردو کے شاعروں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ایسے لوگوں کو سمجھائیں کہ اگر اردو زبان اردو تہذیب اور اُردو تمدّن والوں کو اردو ادب اور اردو تہذیب و تمدّن کو زندہ اور محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہیں اردو والوں سے درحقیقت محبّت ہے تو تم اب اس بے غرض محبت کا پہلے سے بہتر ثبوت مہیا کر سکتے ہو۔ انسانوں کو بانٹنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اردو والوں کی خود اختیاری کو ناحق اپنی حق تلفی قرار دے کر ہنگامہ و فساد کھڑا کر دیا اور پھر انتقام در انتقام کی آگ کو بھڑکایا۔ پاکستان و ہند کے شعرأ و ادباء کو چاہیئے کہ وہ عوام کو عدل و انصاف کے احترام پر مائل کریں جغرافی تسلّط ایک ہونے کا ذریعہ نہیں بلکہ نفاق اور دوئی کا سب سے بڑا محرّک ہوتا ہے ایک ہونے کے لئے محض دلوں کا متحد ہونا ضروری ہے۔ اگر اہلِ ہند اہلِ پاکستان سے محبّت کرنا سیکھ لیں تو ناممکن ہے کہ پاکستان ہندوستان سے محبت نہ کرے۔ محبّت کا جادو دو سلطنتوں کو الگ رہتے ہوئے بھی باہم اتنا متحد رکھ سکتا ہے کہ کشور کشائی کا کوئی بڑے سے بڑا اگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ادباء و شعرائے ہند و پاک کو چاہیئے کہ وہ اپنے اپنے عوام کے دل میں دوسرے ملک کے عوام کے لئے محبّت پیدا کریں تا کہ وہ جگن ناتھ آزاد کے ہم زبان ہو کر صحیح معنوں

ہیں گمراہوں اور مفسدہ پردازوں پر اپنی فتح کا یوں اعلان کر سکیں ؎

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے
دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

ماہنامہ "مخزن" لاہور

ستمبر ۱۹۴۹ء

(سر) عبد القادر

نذرِ اقبال

ذیل کی چند سطور ایک مختصر سے مجموعۂ کلام "نذرِ اقبال"
کے تمہیدی الفاظ ہیں جو قبلہ شیخ سر عبد القادر (مرحوم)
نے تحریر فرمائے تھے۔ یہ مجموعۂ کلام ۴۷ء کے ہنگاموں
کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی بعض نظمیں
"بیکراں" میں شامل کر لی گئی ہیں۔ (ح۔س۔ا)

جگن ناتھ آزاد ہمارے نوجوان ادیبوں میں بہ اعتبار قابلیت و خوبیٔ فکر ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور کیوں نہ ہو ذوقِ شعر انہیں اپنے والدِ بزرگوار منشی تلوک چند تخلص بہ محروم سے ورثے میں ملا ہے جن کی عمر اردو نظم کی خدمت میں گزری ہے۔ آزاد کو چونکہ انگریزی ادبیات سے بھی براہِ راست واقفیت ہے اس لئے ایک مزید خوبی اُن کے طرزِ تخیل میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس پر وہ سر اقبال مرحوم کے طرزِ کلام کے مقلد اور دلدادہ ہیں۔

جگن ناتھ آزاد نثر بھی خوب لکھتے ہیں - کچھ عرصہ ہوا راولپنڈی کے ایک بزم اقبال[1] جلسے میں جس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے اقبال کے کلام پر ایک ناقدانہ مقالہ پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا اور رسالہ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" میں شائع ہو چکا ہے۔

اب جناب آزاد چند نظمیں لکھ کر شائع کر رہے ہیں جن کا موضوع خود اقبال اور کلامِ اقبال ہے۔ یہ گویا عقیدت کے چند پھول ہیں جو انھوں نے اقبال پر نچھاور کیے ہیں۔ اسی لحاظ سے اس مجموعہ کو اقبال کی نذر کیا گیا ہے۔ جو بے ساختہ تعریفیں ان اشعار میں آزاد کے قلم سے نکلی ہیں ان میں ان کا دلی جذبۂ محبت نظر آرہا ہے اور ان میں یہ خوبی ہے کہ مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ محض اظہارِ عقیدت ہے۔ مثلاً یہ تعریف ملاحظہ ہو

تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے
وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند
مہ و ستارہ و برقِ تپاں و مہرِ مبیں
تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند

[1] یومِ اقبال ۱۹۳۶ء

اس مجموعے میں چند تضمینیں بھی ہیں جن میں آزاد نے اپنے معنوی استاد کے مصرعوں پر مصرعے لگائے ہیں۔ یہ گرہ دیکھئے کس خوبی سے پیوست ہوئی ہے۔

ہر لب پہ ہے آزادیٔ کامل کا ترانہ
اس دور میں شاہوں کی حکومت ہے افسانہ
درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اُمید ہے کہ یہ چھوٹا سا مجموعہ بڑے مجموعوں کی اشاعت کا پیش خیمہ ہوگا اور آزاد اپنی ادبی خدمت کو جاری رکھیں گے جس کا بیج اُن کے دل میں اُن کے باپ کے فیضِ صحبت سے جما اور جس بیج کی آبیاری کلامِ اقبال کے اثر نے کی ہے۔

بہاول پور
جنوری ۱۹۳۷ء

بیکراں

کرشن موہن

اگرچہ اردو شاعری کے دورِ جدید کے اکثر شعراء حسنِ رہگذر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ تاہم ادبی روایت کے قیام و استحکام میں ان کا حصہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے اکثر روایت میں تحلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن چند ایک کی روشنی روایت کی سطح سے اُبھر کر نقشِ دوام بن جائے گی۔ آزاد انھیں چند ایک میں سے ہے۔ اس کی شاعری سے دوام کی خوش گوار توقعات وابستہ ہو چلی ہیں۔ شاعری اُسے ورثے میں ملی ہے اور اس کی ہونہار طبیعت نے اس ورثے میں گراں قدر اضافہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شہرت ذرا کم رفتار رہی ہے۔ کیونکہ اُس نے شاعروں

کے کسی خاص گروہ سے منسلک ہونے کی سعی نہیں کی۔ اس کم رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے کلام میں مطالعۂ فطرت کی وہ گہرائی اور گیرائی محسوس نہیں ہوتی جو فراق کی شاعری کا زیورِ حسن ہے۔ آزاد کے طائرِ تخیّل کی آنکھ پرواز میں بھی اکثر نشیمن پر رہتی ہے۔ اس کی غزلیں تخیّل اور تفحصِ الفاظ (جو "ترکیب تراشی" سے مختلف ہے) کے عناصر کی آئینہ دار ہیں مگر شباب کی تبسّم کیفیات اُن میں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہنِ رسا کی پختگی نے شگفتگی کی رعنائیوں سے قبل از وقت اپنا دامن چھڑا لیا ہے۔ آزاد کی اکثر نظمیں اس کمی کی شاہد ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ذہن زودِ تخلیق میں کبھی کبھی صوتی ادراک سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تخیّل اس کی استعمال کردہ بے کیف اور فرسودہ ترکیبوں میں جان نہیں ڈال سکا۔ 'نطق کا دریا'۔ 'تلخیٔ دوراں'، 'بازیٔ محبت'، 'جلتی ہوئی بازی'، 'حسنِ جانانہ'، 'ابرِ نوبہار'، ایسی ترکیبیں اب قارئین کا من بھاتا کھاجا نہیں رہیں۔ یہ نقص اُس کی ہنگامی نظموں میں عام ہے تاہم آزاد کی شاعری کے دوسرے خصائص اس کی اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ انگریزی کے مشہور نفسیاتی نقّاد آئی اے رچرڈز نے اپنی بصیرت افروز اور جامع کتاب 'اصولِ تنقید' میں ایک فن کار کے لئے

متوازن الذہن ہونا نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں ایک اچھا شاعر سودا و جنون کا شکار نہیں ہوتا بلکہ صحت مند جذبات کا پیغامبر ہوتا ہے۔ آزاد کی اکثر نظمیں اور غزلیں اس تنقیدی اصول پہ پوری اترتی ہیں۔ اس کے ہاں بے پناہ جوش نہیں ملتا۔ اس کی ذہنی صحت نے اس کی شدّتِ احساس کو ایک مہذب صورت دے دی ہے۔ اس کی نظموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے تجزیہ کی بجائے تخیلی تجربہ سے کام لینا چاہیئے۔ اس کے ہاں دھندلاہٹ اور پیچیدگی نہیں بلکہ لطفِ بیان کا صاف شفاف بہاؤ ہے۔ انگریزی کے نامور شاعر اور نقّاد کولرّج نے ایک دفعہ کہا تھا کہ مجھے وہی نظم محظوظ کر سکتی ہے جس میں معانی اور موسیقی میں سے ایک عنصر ضرور ہو۔ آزاد کی کافی غزلوں اور نظموں میں یہ دونوں عناصر موجود ہیں۔

آزاد کی کتاب "بیکراں" کی مندرجہ ذیل دو رباعیاں معانی اور موسیقی کے امتزاج سے پیدا شدہ لطافتِ تخیل کی نہایت کامیاب مثالیں ہیں۔

احساس میں کو دمک رہی ہے گویا — پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں — شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

(رقص)

رقص کی کیسی دل افروز تصویر کھینچی ہے۔

ایک اور رُباعی دیکھئے

اُٹھے وہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل
لو شانۂ افلاک پہ ڈھلکے بادل
سرشار جہاں ہوا ہے دو چھینٹوں سے
ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

موسیقیت اور روانی آزاد کی اکثر اچھی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کی دو آزاد نظمیں 'دائرے' اور 'سکوت'۔ "بیکراں" کی چند ایک غزلیں 'پناہ گزیں'، 'شکستِ ملا' اور 'اے امیرِ کارواں' اس خصوصیت کی کامیاب مثالیں ہیں۔

آزاد نے اُردو شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا جوہر غزل میں زیادہ چمکا ہے۔ اس نے اپنی غزلوں میں سیاست کے تاثرات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمو کر غزل کے نئے رجحانات میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے 'بیکراں' کی پہلی غزل تقسیمِ ہند کے بعد کے تاثرات کی مؤثر تصویر ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں سیاسی موضوع کے باوجود غزل کے مزاج کو نہایت خوبی سے برقرار رکھا ہے۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری
کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پائے تھے　　　بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

آزاد کی اکثر غزلیں خارجی رنگ کی حامل ہیں۔ ان میں اس کا اپنا غم دوراں میں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنے خیال انگیز مقالے —— "روایت اور انفرادی جوہر" (ٹریڈیشن اینڈ دی انڈیو جیول ٹیلنٹ) میں کہا ہے کہ "ایک فن کار کے ارتقاء کا راز خودی کے مسلسل ایثار میں مضمر ہے"۔ فن کار کا یہ ایثار تخلیق کو کلاسیکی مزاج دے دیتا ہے۔ آزاد کی غزلوں کے خارجی رنگ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا میلانِ طبع زیادہ تر کلاسیکی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس مزاج کے مظہر ہیں۔

تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر چمن ویران ہُوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں　　　منزل کہاں یہ حُسنِ سرِ رہگذر کہاں

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے
کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

وہ دل عطا کر کہ جس کو ہوں پردہ ہائے گردوں بھی ناگوارا
نگاہ وہ دے کہ سنگِ خارا کو چیر کر دیکھ لے شرارا

ذیل کے اشعار کا لباس کلاسیکی ہے۔ استعجاب و تجسس کے عناصر نے ان کے مزاج کو رومانی بنا دیا ہے۔ تاہم آزاد کے علائم اور ترکیبیں کلاسیکی جمود کی حامل ہیں۔ اس کا ذہن نئی نئی شگفتہ ترکیبیں تراشنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر بھی یہ شعر مزا دے جاتے ہیں کیونکہ ان میں ایک گنجِ معانی پنہاں ہے۔

آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر
جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

یہ فقط آنسو نہیں اے چشمِ ظاہر بیں دوست
اپنی پلکوں پر لئے بیٹھے ہیں اک افسانہ ہم

عشرت کدۂ جادوئے بابل ہیں لبِ لعل
آنکھیں تری حیرت کدۂ سحرِ مغانہ

پھولوں سے، بہاروں سے، ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

کیا جانیے آزاد مرا عشقِ جنوں خیز
جینے کا سہارا ہے کہ مرنے کا بہانہ

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسم کا جواب
پھول کھل کر بھی حریفِ رخِ جاناں نہ ہوا

میں نے چاہا تھا بہاروں میں سما جاؤں مگر
یہ نظارہ بھی مرے شوق کے شایاں نہ ہوا

شعر و سخن میں ناممکن اظہار ہیں جن افسانوں کا
پلکوں پہ بے تاب سے قطرے وہ خاموش افسانے ہیں

ہنس کے دیکھنے والے تیری بے وفائی کا غم جہاں پہ لے آیا
اُس مقام پر ہم کو اب نہیں گوارا یہ غم کو کچھ زباں پہنچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلا مجکو ، تم سے کیا ملا مجکو
میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مسکرا اُٹھی تم جہاں جہاں پہنچے

گلستاں کو دیکھ آئی ، کہکشاں سے ہو آئی ، آسماں کو چھو آئی
اے نگارِ ناپیدا اب تری تمنّا میں آرزو کہاں پہنچے

دوست کے تجسّس میں ہم نکل گئے اکثر منزلوں سے بھی آگے
ساتھ چھوڑنے والو ، اب تمھیں بتائیں کیا ہم کہاں کہاں پہنچے

: یہ غزل فرسودہ علایم کے باوجود جستجو کی تڑپ اور اسلوب کی روانی کے
باعث ایک کیفیتِ وجد پیدا کر دیتی ہے

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر   دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندیٔ ساحل کیا جانے

بہار آئی ہے اور میری نگاہیں کانپ اُٹھی ہیں
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

اس شعر کی سادگی نے اس کے تاثر کو چار چاند لگا دئے ہیں،

مذکورہ بالا خط کشیدہ ترکیبوں کی نیم فرسودگی ان شعروں سے لطف اندوز ہونے میں بہت کم مانع ہوتی ہے اور یہ آزاد کے پُر معنی اور رچنۃ خیالات کا کمال ہے۔

نظمیں

آزاد کی نظمیں متنوع موضوعات پر حاوی ہیں۔ اس کی ہنگامی نظمیں جوش ملیح آبادی سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ "طبل و علم" کے دیباچے میں جوش نے لکھا ہے۔ "آزاد کے انفاسِ گرم نے ان نظموں میں وہ برقی رَو دوڑا دی ہے جو ادب کے افق پر ہمیشہ درخشاں رہے گی۔" چند ایک ہنگامی نظمیں واقعی قابلِ داد ہیں۔ مثلاً "پناہ گزیں" "غلط فہمی" "سبھاش چندر بوس۔ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر" "ہندوستانی سپاہیوں کا ترانہ" وغیرہ۔ ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اپنی 'خودی' کو حقیقت میں جذب کرنے کی مخلص اور مسلسل کوشش کی ہے۔ 'پناہ گزیں' ایک کامیاب ہنگامی تخلیق ہے۔ اس میں اس کا اپنا غم غمِ دوراں میں مدغم ہو گیا ہے اور یہی شاعر کی عظمت کا راز ہے۔

خموشیوں میں حادثوں کی داستاں لئے ہوئے

دلِ حزیں میں دردِ غم کا اک جہاں لئے ہوئے

نگاہ میں حدیثِ جورِ دوستاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

مکاں کسی کا جل گیا، کسی کا گھر اُجڑ گیا

کسی سے کوئی زندگی کا آسرا بچھڑ گیا

لُٹی ہوئی، بجھی ہوئی جوانیاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

اگرچہ دُور آ چکے دھڑک رہے ہیں دل ابھی

قدم میں کپکپی سی ہے نظر ہے مضمحل ابھی

خموش لب پہ حشرِ نالہ و فغاں لئے ہوئے

رواں ہے ایک قافلہ

پناہ گزینوں کے قافلوں کی سچی اور نہایت دردانگیز تصویر کھینچی ہے۔

اگرچہ "طبل و علم" کی اکثر نظمیں بوسیدہ ترکیبوں سے چھٹکارا نہیں پا سکیں اور ان میں استعارات اور تشبیہیں نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم شاعر کے

جذبات کا خلوص آئینہ ہے۔

ان میں سے اکثر نظمیں منظوم صحافت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں پھر بھی چند ایک تاریخی شعور کی بدولت اس سطح سے اُبھر آتی ہیں۔ مثلاً 'سبھاش چندر بوس — بہادر شاہ ظفر کے مزار پر'۔

آزاد کی فطری اور واقعاتی نظموں میں ورڈز ورتھ کی ابتدائی نظموں کی خلوص آمیز سادگی جھلکتی ہے۔ اس کے جذبات کسی گہرے فلسفہ کے شائبہ سے پاک نظر آتے ہیں۔ 'طوفان کے بعد'، 'ایک منظر۔ سناور کی بلندیوں سے'، 'شکنتلا'، 'ایک آرزو'، 'وطن میں آخری رات'، 'کنارِ راوی' وغیرہ کے رواں دواں اسلوبِ بیاں کی خوش آہنگ سطحیت ایک گہرے غم کا نقاب ہے۔

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے
زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد

لیکن اے آرزوئے دیدہ ذرا غور سے دیکھ
کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی
لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور

تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں
میری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

(طوفان کے بعد)

طوفانوں میں گھرے ہوئے شاعر کے ارادوں کی امید کوشی قابلِ داد ہے

وہ صبح کے دامن میں چھلکتے ہوئے آنسو — وہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہوا تارا

ق

کس حسن سے بدمست گھٹاؤں میں ہو ساغر — کہسار کی چوٹی کا فلک بوس کنارا

شاید تری رفتار سے ٹکرا کے گئی ہے — ملتا ہی نہیں ہے کوئی بدلی کو سہارا

(ایک منظر — سناور کی بلندیوں سے)

آزاد کی وہ نظمیں جو اس نے اپنی بیوی "شکنتلا" کی وفات پر کہی ہیں اس کی حساس طبیعت کی مظہر ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اس کی نظم "شکنتلا" کو "آنسوؤں کا تاج محل" کہا ہے۔ مرحومہ نے اپنے آخری ایام علالت شملہ کی پہاڑیوں میں گزارے تھے۔ یہ سب متعلقات "شکنتلا" میں ایک مؤثر فضا قائم کر دیتے ہیں۔

ریل گاڑی رک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے

ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

دیکھ لے اک بار پھر اے دیدۂ خونبابہ بار

سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار

اے درخت میں تو سمجھا تھا کہ تم چھو ہو گے جب
ایک مرجھائی ہوئی پتی کا منہ چوموگے تب
وہ تمھارے لمس سے اک شادمانی پائے گی
شادمانی سے سرورِ زندگانی پائے گی

ہمتیں باقی تھیں اپنی حوصلے ٹوٹے نہ تھے
آبلے تھے پاؤں میں لیکن ابھی پھوٹے نہ تھے
التجا کی تھی کہ اے نیناوتی کے کوہسار
ملتجی ہوں میں ترے آگے بچشمِ اشک بار
جانفزا موسم سے یوں ارشاد فرمادے ذرا
اک مریضِ خستہ جاں کو فیض پہنچادے ذرا
تو نے میری التجاؤں کی ذرا پروا نہ کی
درد میں ڈوبی دعاؤں کی ذرا پروا نہ کی
میرے آنسو پتھروں پر رائیگاں گرتے رہے
ایک دنیا کی نگاہوں سے نہاں گرتے رہے
آزاد کے سوزِ نہاں نے ان آنسوؤں کو نہاں نہیں رہنے دیا۔

نظم کے آخری حصّہ میں مرحومہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

اے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے

آگ کے شعلوں میں جا سوئی ہے کس آرام سے

اس شعر میں کتنا شدید سوز پنہاں ہے!

غمِ حیات سے آشنا ہونے کے باوجود آزاد کی شاعری میں سرکہ جبینی نے راہ نہیں پائی۔ وہ دردمند دل کے نغمے الاپتا ہے لیکن کلبیت کی سیاہی اُس پر بھی مسلّط نہیں ہوتی۔

محرومؔ کا سوز و گداز بھی سوائے "شکنتلا" کے آزاد کی حزنیہ نظموں میں سوز و ساز ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور نظم "ایک آرزو" میں مرحومہ سے یوں خطاب کرتا ہے۔

دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے

کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

برگِ گُل پر قطرۂ شبنم کی بے تابی میں ہے

یا مرے سوکھے ہوئے آنسو کی نایابی میں ہے

آج یہ لرزہ براندام اُجالا لیکن | آپ ہی آپ سمٹتا سا چلا جاتا ہے
کوئی برچھی، کوئی خنجر، کوئی پتھر کوئی اینٹ | مرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

(وطن میں آخری رات)

”لرزہ براندام اُجالا“ جیسی ترکیبیں آزاد کے کلام میں بہت ملتی ہیں

قہقہے کتنے ترے سامنے دم سادھ گئے | اپنے تلوار ذرا دیکھ حکومت کی ہوس
کتنی ہنستی ہوئی کلیاں تھیں کہ ویران ہوئیں | یوں ترے شور سے جاگے ہیں اسیرانِ قفس

تاثّرات

کسی شاعر کی عظمت کا معیار اس بات سے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے فن کاروں سے کیا اور کیسے مستعار لیتا ہے۔ ٹی، ایس، ایلیٹ نے کہا ہے۔ ناپختہ شعرا تقلید کرتے ہیں اور پختہ شعراء اپنا لیتے ہیں۔ بُرا شاعر جو چیز لیتا ہے اسے مسخ کر دیتا ہے۔ اچھا شاعر اُسے بہتر یا کم از کم مختلف چیز بنا دیتا ہے۔ اچھا شاعر خیالِ مستعار کو وحدتِ احساس میں مدغم کر کے اُسے تعمیری کلیّت عطا کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد خیالِ مستعار ایک بے نظیر اور اپنے ماخذ سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے۔ بُرا شاعر اسے ایک غیر مربوط چیز میں منتقل کر دیتا ہے۔ اچھا شاعر عموماً قدیم یا مختلف المسلک یا غیر زبان کے مصنفین سے مستعار لیتا ہے۔ آزاد

کی زبان و بیان کا خمیر قدیم فارسی شاعروں سے اپنائے ہوئے اور رچے ہوئے اثر سے اٹھایا گیا ہے۔ ان میں سے وہ کسی شاعر سے متاثر نہیں ہوا بلکہ یہ سب اُس کے کلام پر مجموعی طور پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ تاثر اُس کے مزاج میں اس قدر رچ چکا ہے کہ غیر محسوس ہو کر رہ گیا ہے۔ اور یہی ایک پختہ شاعر کا کمال ہے۔

آزاد پر اپنے والد محترم حضرت محروم کا اثر ہونا ناگزیر تھا۔ دونوں کی شاعری کا کلاسیکی مزاج اوّل الذکر کی اثر پذیری کا شاہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میدانِ تخلیق میں آزاد کا اجتہاد زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتا۔ اقبال کا اثر بھی آزاد کی اکثر نظموں کے اسلوبِ بیان میں آئینہ ہے۔ قدیم فارسی شعراء سے اقبال، محروم اور آزاد نے اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق استفادہ کیا ہے۔ آزاد نے اقبال کی چند ایک غزلوں پر نہایت کامیاب تضمینیں کی ہیں۔ اقبال کی طرح آزاد کی اکثر نظموں میں اس کے ہندوستان کی سماجی اور سیاسی کیفیات کی ترجمانی موجود ہے۔ لیکن اقبال کی شاعری کی فلسفیانہ عظمت اور رعب داب سے آزاد کا کلام محروم ہے۔ آزاد کے کلام میں جدید نفسیاتی مسائل کی ترجمانی بھی نہیں ملتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اُس نے انگریزی اور فرانسیسی شاعروں کا مطالعہ بہت کم کیا ہے۔ نفسیاتی خردہ بینی کے فقدان نے آزاد کی شاعری کو ابہام و کیفیتِ انقباض سے بچا

لیا ہے اور ایک متوسط قابلیت کا شخص بھی اس سے کیف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کا انبساط افروز کلام تنہائی کے لمحوں کا بے لوث رفیق ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ کہنے میں مجھے ذرا باک نہیں کہ آزاد کی نظموں اور غزلوں نے جدید اُردو شاعری کی نیم مریضانہ فضا کو ایک خوش گوار تبدیلی سے آشنا کر دیا ہے ؏

دہلی

فروری ۱۹۵۰ء

مطبوعہ ماہنامہ "راہی" دہلی

شکنتلا

عدم

جن لوگوں نے پروانوں کو والہانہ سپردگی سے شمع کی لَو پر لپکتے ہوئے دیکھا ہے وہ اس نظریے سے انحراف نہیں کر سکتے کہ محبّت زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ انسان میں جو روحانیت کا احساس پایا جاتا ہے وہ اس لطیف کیفیت کا شرمندۂ تخلیق ہے جس کو نفسیاتی اصطلاح میں محبّت کہتے ہیں۔ محبّت اس اعتبار سے کوئی آسمانی چیز نہیں کہ اس کی تخلیق انسان کے ضمیر ہی سے ہوتی ہے اور انسان کا ضمیر مادّی عناصر کی پیداوار ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محبّت ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ اور محبّت ہی انسان کے ترکش کا سب سے بڑا تیر ہے جو حوادثِ کون و مکاں

کی آہنی دیواروں کو بھی چیر کر نکل جاتا ہے۔ محبّت انسان کا سب سے بڑا اخلاق اور دنیا کی سب سے بڑی تہذیب ہے۔ انسان فطرتاً نیکی کی طرف مائل ہے اور اسی فطری صلاحیّت کے پیشِ نظر اس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تہذیب و تمدّن کی گمراہ کن ترکیبوں کے نرغے میں پھنس کر وہ اپنے اصل مرکز سے دور ہٹ جاتا ہے۔ آج بھی اس فساد و رستخیز اور ہنگامہ و شر کی آتش بار تحریکوں کے پسِ پردہ کتنی بے لوث اور حقیقت شناس انسانیتیں اطمینان سے انسان کی وارفتگی پر زہر خند ہنس رہی ہیں۔

آزاد بھی انسانوں کے اس عظیم المرتبہ گروہ سے تعلّق رکھتا ہے جن کے ضمیر میں محبّت و انسانیت کا امرت کثرت سے شامل کیا گیا ہے اور یہ مجموعہ جو اس کی پانچ المیہ نظموں پر مشتمل ہے حزن و ملال کے اس حقیقی جوہر کا آئینہ دار ہے جس میں سچی محبّت کی روشنی اور حقیقی انسانیت کی حلاوت کے چشمے اُبل رہے ہیں۔

ان نظموں میں آزاد کا حقیقی کیریکٹر پوری جامعیت سے نمایاں ہے۔ نظمیں ہر چند اس کی مرحوم رفیقۂ حیات کے تاثراتِ فراق سے تعلّق رکھتی

ہیں تاہم محبت کی وہ عالمگیر وسعت جو انفرادی حدود سے تجاوز کر کے مناظرِ فطرت کے جامد اور بے احساس پیکر میں انگڑائیاں لے رہی ہے ایک ایسے انسان کا تصوّر پیش کرتی ہے جس کو تمام کائنات میں سوائے محبت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

مجموعے کی پہلی نظم کا پہلا شعر ہی شفاف آنسوؤں کا ایک ایسا تسکین بخش سرچشمہ معلوم ہوتا ہے جس سے ناشاد روحیں حقیقی اطمینان اخذ کر سکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل شعر میں چھلکتا ہوا پیمانۂ غم کوثر و سلسبیل سے کم حلاوت بخش ہے۔

ریل گاڑی رُک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے

دوسری نظم جس کا عنوان "ایک آرزو" ہے۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعر کا ادراک تصوّرِ زمان و مکان سے کلیتہً آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک روحِ لطیف سکون کی تلاش میں اتھاہ فضاؤں میں بے قراری سے پرواز کر رہی ہے۔ محاکات کے ایسے نادر و لطیف نمونے اردو لٹریچر میں بہت کم پائے جاتے ہیں

آج شاید تو مکان و لامکاں سے دور ہے — اس زمیں سے دور ہے اس آسماں سے دور ہے
چاند تاروں سے پرے ہے کہکشاں سے دور ہے — عقل سے ادراک سے وہم و گماں سے دور ہے
حلقۂ روز و شب و شام و سحر سے دور ہے — تو جہاں بھی ہے مری حدِ نظر سے دور ہے
کیا خبر مسکن ہے تیرا آج کل کس دیس میں — کون سے خوابوں کی دنیا میں ہے کیسے بھیس میں
کیا خبر اس دیس کا کیا حال ہے کیا رنگ ہے — رہنے سہنے بات کرنے کا وہاں کیا ڈھنگ ہے
کاش مجھ کو تیری دنیا کا پتہ دیتا کوئی — تو کہاں ہے مجھ کو اتنا ہی بتا دیتا کوئی

کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو — یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بو
یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گم — یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گم
مائلِ آرام تو مہتاب کے ایواں میں ہے — یا کہیں آسودہ میرے خاطرِ ویراں میں ہے
تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں — یا پسند آئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں
ہو گئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں — یا ٹھکانہ کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں
جس کو تو محبوب تھی تو اس فضا میں تو نہیں — تو پہاڑوں کی جنوں پرور ہوا میں تو نہیں
دور افق کی منزلوں سے بھی کہیں تیرا ہے گھر — یا ہے تو خورشید کی پہلی کرن میں جلوہ گر
دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے — کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

برگ گل پر قطرۂ شبنم کی بے تابی میں ہے
یا مرے سوکھے ہوئے آنسو کی نایابی میں ہے

تتلیوں کے خوش نما رنگوں میں آرامیدہ ہے
وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

ایک نظم کا عنوان "کسولی" ہے۔ جس میں کسولی کی رعنائیوں اور بہار آفرینیوں سے ایسا طنز آمیز تخاطب اختیار کیا گیا ہے جیسے ایک بے مروت میزبان سے کیا جاتا ہے اس تخاطب میں شاعر کے اندازِ بیان کی شگفتگی اور اظہارِ مقصد کی تلخی کا امتزاج ایک ایسی متحرک اور زندہ تصویر پیش کرتا ہے جس کا مشاہدہ یہ ماننے پر مجبور کر دیتا ہے کہ پھول، ہوا، پتھر، اشجار تمام چیزیں انسان کی طرح حساس ہوتی ہیں۔ کبھی شدتِ غم سے کراہتی ہیں کبھی فرطِ مسرت سے ہنس پڑتی ہیں۔ یہاں شاعر اور مناظرِ فطرت دو مختلف حقیقتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ شاعر فطرت کے ضمیر میں اتنا مدغم نظر آتا ہے کہ جزو فطرت ہونے کے سوا اس کے وجود کی کوئی دلیل باقی نہیں رہتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی بے قرار روح ایک بھونرے کا روپ بدل کر فضا بسیط میں دیوانہ وار مصروفِ رقص ہے۔ اور اسی رقص کے زیر و بم میں ایک گم شدہ پھول کی خوشبو بھی بھڑک رہی ہے۔

کسولی میری امیدوں کی دنیا لوٹنے والی
کسولی کوہِ غم کی طرح مجھ پہ ٹوٹنے والی

زمانے بھر کے سیّاحوں کو راحت بخشنے والی
مجھے لیکن شکستِ انجامِ محنت بخشنے والی

گلہ ہے مجھ کو، تجھ سے اور تیری دل رُبائی سے
ترے اشجار کی جاں پروری سے جاں فزائی سے

جنوں پرور فضاؤں سے سکوں پرور ہواؤں سے
ترے پھولوں کی رعنائی سے متوالی گھٹاؤں سے

گلہ ہے مجھ کو تیرے جھیل کے اونچے درختوں سے
قریب و دُور تک پھیلے ہوئے پھولوں کے تختوں سے

ترے پہلو میں ہیں جو خیمہ زن اُن نو بہاروں سے
جو عقل و دل کو دیوانہ بنا دیں ان نظاروں سے

فضاؤں میں جو ہیں محوِ خرام اُن ابر پاروں سے
ہے روشن جن سے تیری انجمن ان چاند تاروں سے

کبھی وہ الم پرور زمانہ یاد ہے تجھ کو
مری بیہم شکستوں کا فسانہ یاد ہے تجھ کو

جب آیا تھا یہاں میں اس فضا کا آسرا لے کر
گھٹاؤں کا نسیمِ دل کشا کا آسرا لے کر

گھنی چھاؤں کا سرو و یاسمن کا آسرا لے کر
چمن کا اور چمن کے بانکپن کا آسرا لے کر

گلستاں کی بہارِ جاں فزا کا آسرا لے کر
جو فرحت بخشتی ہے اس ہوا کا آسرا لے کر

میں آیا تھا کہ شاید تو مجھے دل شاد کر دے گی
مرے دامن کو گل ہائے طرب انگیز سے بھر دے گی

موت کی حقیقتِ مستور چونکہ آئینۂ حیرت کے مماثل سے ہے۔ اس لئے ان نظموں میں کہیں کہیں اقبال کا فلسفیانہ رنگ بھی در آیا ہے لیکن پوری شیرینیٔ تغزل کے ساتھ۔

طواف کر کے نگاہِ عمیق لوٹ آئی — عجیب گنبدِ بے در ہے جلوہ گاہِ صفات

مئے نشاط کا ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا — کھلی جو آنکھ تو سارا طلسم ٹوٹ گیا

مزاجِ بوستاں میں برہمی محسوس کرتا ہوں — کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کرتا ہوں

دل و نظر کی پریشانیوں کا حال نہ پوچھ — کہ اب تو ہاتھ بھی اُٹھتے نہیں دعا کے لئے

اللہ اکبر! حزن و ملال کے اس پُر خلوص آئینے میں حقیقی انسانیت کے کتنے صحیح نقوش دمک رہے ہیں

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں (فراق)

لاہور

مارچ ۱۹۴۷ء (مطبوعہ "زمانہ" کانپور)

بیکراں

شہاب ملیح آبادی

"یہ کیا ہے؟" میں نے آزاد سے پوچھا

آزاد نے کہا۔" میں بڑا بھاری شاعر ہو گیا ہوں، یہ میری نظموں کا نیا مجموعہ ہے "بیکراں۔"

میں نے دل میں سوچا۔" بھاری شاعر، ہوں لیکن" بیکراں —— زندگی" اور مجموعے کو گھر لے آیا اور جو جاننے والا مل گیا اُس سے میں نے کہا۔ "آزاد بڑا بھاری شاعر ہو گیا ہے۔"

ہندوستان میں دو چیزیں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سانپ اور شاعر۔ ہر گھر میں ایک سانپ ہے اور ہر گھر میں ایک شاعر۔ سانپوں کی ہزاروں قسمیں ہیں

اور شاعر بھی لاتعداد قسموں کے ملتے ہیں۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ تعداد کا فرق انیس بیس ہو گا۔ سانپ کے کان نہیں ہوتے، اکثر و بیشتر شاعروں کے بھی کان نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی ہیں تو کچے کان ہوتے ہیں۔ شاعر کے سامنے حادثے کی کڑک کتنی ہی خوفناک کیوں نہ ہو، اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی، جُوں رینگے کہاں جب کان ہی نہیں ہوتے۔ شاعر اپنا سُر الاپتا رہتا ہے۔ مثلاً آپ ایک صدی پیچھے جائیں اور اُردو کے شعراء کی "بیدارمغزی" کا اندازہ لگائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ۱۸۵۷ء ایسا سانحہ تاریخ ہندوستان کے سر پر گونجا لیکن ہمارا شاعر گل و بلبل، جام و مینا، فراق و وصال کے چکر میں پڑا رہا۔ حد ہے غالب ایسا بیدار شاعر بھی، اس ہنگامۂ عظیم کو یوں ہی دیکھتا گزر گیا۔

دونوں میں زہر ہوتا ہے۔ دونوں زہریلے ہوتے ہیں، جس طرح سانپوں میں کوئی کم کوئی زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شاعر بھی زہریلا ہوتا ہے۔ لیکن کسی شاعر میں زہر کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ بعض سانپوں میں زہر ہوتا ہی نہیں ہے تو بعض شاعروں ہی میں کب ہوتا ہے؟

سانپ اور شاعر دونوں خلوت پسند ہوتے ہیں۔ انگریزی میں انھیں شرمیلا کہتے ہیں، کچھ سانپ جنگلوں اور سوراخوں کو چھوڑ کر باہر کی ہوا کھانے لگتے ہیں، اسی طرح بعض شعراء بھی اعتکاف کو ناپسند کرتے ہیں، طبعاً و فطرتاً دونوں خلوت کے

دل دادہ ہوتے ہیں اور انھیں خلوت ہی راس آتی ہے اور دونوں کے دل کی کلی خلوت ہی میں کھلتی ہے۔

دونوں کے ڈنک ہوتے ہیں اور دونوں اپنے حریف کے ڈنک مارتے ہیں۔ فرق صرف اُن اثرات میں ہوتا ہے جو حریف پر پڑتے ہیں۔ دونوں خاک پھانکتے ہیں، لیکن دونوں موسیقی پر جھُوم جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے، کیونکہ موسیقی کا تعلّق کان سے ہوتا ہے اور دونوں کان سے محروم ہوتے ہیں، پھر وہ موسیقی پر جھوم کیوں جاتے ہیں۔ یہ وہ راز ہے جس کا انکشاف صرف نفسیات کی گہرائی میں اُتر کر ہو سکتا ہے۔

دونوں میں احساسِ برتری ہوتا ہے اور دونوں "ادب برائے ادب" کے قائل ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے کام، جان ہے تو جہان ہے پیارے، سانپ کو ماموں کہہ دو تو کاٹتا نہیں۔ شاعر کو داد دے دو، تمام ڈنک بے کار ہو جاتے ہیں۔

ان مشترک باتوں کے علاوہ سانپ اور شاعر میں فرق بھی ہے۔ مثلاً سانپ ویرانی کے جنگل میں پھن اُٹھا کر افتکار تا رہتا ہے اور شاعر آبادی کے جنگل میں پھُنکارتا ہے۔ سانپ اپنے زہر سے دوسرے کو ہلاک کر دیتا ہے،

شاعر اپنے زہر سے خود ہی مر جاتا ہے۔ سانپ ڈنک مارتا ہے تو حریف کی نبضیں ساقط ہو جاتی ہیں، شاعر کے ڈنک سے وہ ساقط نہیں ہوتیں تیز ہو جاتی ہیں۔ لیکن جہاں یہ ہے وہاں یہ بھی کہ سانپ کے کاٹے کا منتر ہے شاعر کے کاٹے کا منتر نہیں ہے۔ سانپوں کی کثرت کی ذمہ دار قلت ہے اور شعراء کی افراط کا مجرم سماج۔ سانپ سماج کے لئے خطرناک ہے اور شاعر سماج کے لئے مفید بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا "ہو سکتا ہے" "ہے" نہیں کہا۔ شاعر مفید ہو سکتا ہے اور سانپ اور شاعر کا یہی وہ فرق ہے جس کی کسوٹی پر میں آزاد کے کلام کو پرکھنا چاہتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ آدم و حوا کو جنت سے نکلوانے والا بھی سانپ تھا، یہ سانپ نہ ہوتا تو آدم کی بہشت فردوس گم شدہ نہ ہوتی۔ لیکن اگر سانپ یہ زہر نہ اگلتا تو شاعر کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ شاعر سماج کے لئے کیونکر مفید ہو سکتا ہے؟ سماج کے لئے مفید ہونے کا مطلب کیا ہے؟ شاعر کی افادی حیثیت کس صورت سے پیدا ہوتی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب سے ایک طرف "ادب برائے ادب" کے نظریے کو سانپ سونگھ جاتا ہے تو دوسری طرف شاعر کے سامنے امکانات کے ہزار دریچے کھل جاتے ہیں، اگرچہ اس کا مسلک غیر متعین ہو جاتا ہے۔ شاعر کی افادیت کے لئے کوئی خاص ضابطہ و قانون متعین نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے، کل کا مفید شاعر آج کے سماج کے لئے

غیر مفید بلکہ مضرت رساں ہو اور آج کا شاعر کل اپنی افادیت کھودے۔ آج کا مسیحا کل کا مریض ہو سکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا بھی ہے، اس لئے ہر شاعر کو اپنے عہد کی نبضوں پر ہات رکھ کر اس بات کا اندازہ کرنا ہے کہ ہمارے سماج کے اندر کن کن بیماریوں کے جراثیم پیدا ہو چکے ہیں اور اُسے تندرست و توانا کرنے کے لئے کس قسم کے ٹانک کی ضرورت ہوگی؛ سماج کی احتیاج کیا ہے؟ سماج بدلتا رہتا ہے، اس طرح سماج کے حق میں مفید ہونے کے لئے شاعر کا بدلنا ازحد ضروری ہے۔ جو شاعر اپنی "وضع" پر قائم رہتا ہے اُسے یہی شکایت رہتی ہے "راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟" اگر شاعر کو محبوب سے ملنا اور مطلب براری کرنا ہے تو اُسے "راہ" پر آنا ہوگا۔ "بزم" کی ہٹ چھوڑنا ہوگی۔

میں نے "بیکراں" کا پہلا ورق اُلٹا تو اقبال کا ایک قطعہ نظر کے سامنے آیا جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

برآور ہرچہ اندر سینہ داری — سرودے، نالۂ آہے، فغانے

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، سانپ اور شاعر دونوں میں زہر ہوتا ہے اور فطرتاً دونوں زہر اُگلنے پر مجبور ہیں۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ شاعر کو زہر اُگلتے وقت اس بات کا ضرور اندازہ کرنا ہے کہ سماج کے لئے کس قسم کا زہر مفید ہوگا۔ شاعر سرود، نالہ، آہ اور فغاں کے ذریعے سے جو بھی اور جتنا بھی زہر اُگلے اُسے خود ضرور چکھ لے ورنہ پھر

شاعر اور سانپ میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ شاعر وہی ہے جو اپنے زہر سے خود ہلاک ہو کر دوسروں کو زندہ و بیدار کر دے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آزاد دیکھ کر ڈنک مارتے ہیں، آنکھ پر پٹی باندھ کر جا و بے جا نہیں پھنکارتے۔ آزاد کا یہ شعر کم و بیش میرے مافی الضمیر کی ترجمانی کر دیتا ہے

یہ گلشن نو ہے گلشن نو اے فکر کہن کے دیوانو
ہمیارتفکر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

دوسرا شعر ہے ؎

چمن بدلا، چمن کا رنگ بدلا، باغباں بدلے
یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

ان اشعار میں ذہنی رجحان کچھ ایسا ہے کہ یہ سوال بے ساختہ بیدار ہو جاتا ہے کہ آزاد "ترقی پسند" ہے یا کچھ اور۔ میں اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا کہ ترقی پسند ادب کیا ہے، کیا نہیں۔ اگر حضرت آزاد "ترقی پسند" ہیں تو ان کے اعمال کی سزا انھیں کو ملے گی، میرا کیا جائے گا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان زبردست انقلاب سے روشناس ہوا۔

برطانوی سامراج نے قومی تحریک کے آگے سپر ڈال دی۔ اور ہندوستان کے اُفق سے وہ صبح طلوع ہوئی جسے سیاسی زبان میں "یومِ آزادی" کہا جاتا ہے، لیکن جشنِ آزادی کے ساتھ ہی تقسیمِ ہند کے جلو میں جو فتنے برپا ہوئے اس نے دردمند و حساس قلوب کو زبردست ٹھیس پہونچائی۔ اس ٹھیس کی خراش سے دردمند لوگ دو حصوں میں بٹ گئے۔ آزاد اس گروہ میں آئے جس میں نسبتاً سیاسی شعور زیادہ تھا اور جو گروہ، فرقہ وارانہ طرزِ فکر سے بچ کر ہندوستان کو روشن مستقبل کی طرف لے چلنے کا متمنی ہے۔ آپ آزاد کے کلام میں یہ تمنا کہیں نہیں پائیں گے ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ادیبوں کی برادری کے جذبات کروٹیں لے رہے ہیں۔ وہ پاکستان و ہندوستان کے بیدار ادیبوں کو ایک خاندان کے چشم و چراغ تصوّر کرتے ہیں اور ان کے تخیل کی پرواز میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فرقہ وارانہ سیاست کے جال میں آب و دانہ دیکھ کر اُس میں اُتر پڑے ہوں۔ آزاد کا یہ شعر کیا خوب ہے ؎

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے   کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

"مقصدِ حیات" سے وابستگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ آزاد "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں اور اس شعر میں جس "مقصدِ حیات" کی طرف اشارہ اور جس "غبار" کی تحقیر ہے وہ میرے اس دعوے کو صحیح ثابت کر دیتی ہے کہ ان کے دل و دماغ پر فرقہ پرستی کا بھوت سوار نہیں ہے۔

بلکہ اُن کا ہر شعر ایک منتر ہے جو اس بھوت کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے نغمے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

آزاد کی رُوح پر ڈاکٹر اقبال مرحوم کا بھی گہرا پرتو ہے۔ اسلوبِ بیاں پر اقبال ہی کی تکنیک حاوی ہے اور اقبال ہی کی طرح وہ پہلے یہ سوچتے ہیں کہ "کیا کہنا ہے۔" اور یہ بعد میں غور کرتے ہیں۔ "کس طرح کہیں۔" ع شہبازِ معانیست بدام اقبال۔ اس مصرع پر جو رشک ظاہر کیا گیا ہے وہ آزاد کی تمنّا کو برہنہ کر دیتا ہے۔ ہمارے شعراء میں کچھ "اندازِ بیاں" کے پجاری ہیں اور "صوری کمال" پر جان دیتے ہیں اور کچھ "معنوی کمال" کی سبقت پر زور دیتے ہیں۔ "لکھنؤ اسکول" اور "دہلی اسکول" ان حریفوں کے برسوں اکھاڑے رہ چکے ہیں۔ شاعر ایک حیثیت سے اپنی قوم کا رہبر ہوتا ہے اور اگر وہ سماج کے لئے مفید ثابت ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنی قوم کو راستہ دکھانا پڑتا ہے۔ آزاد کی شاعری عصرِ حاضر سے مایوس اور مستقبل کی طرف نگراں تو ضرور ہے لیکن مستقبل کے بارے میں اُن کا کلام کوئی واضح راستہ پیش نہیں کرتا۔ اُن کا یہ شعر میرے اس دعوے کی گواہی ہے ؎

کہاں ہے منزلِ نظر، مجھے کوئی پتہ نہیں ۔۔۔ ابھی تو یہ خبر نہیں کہاں سے آ رہا ہوں میں

یہ ٹھیک ہے کہ شاعر لیڈر کی طرح کوئی ٹھوس پروگرام وضع نہیں کرتا لیکن اس کے ذہن میں کم سے کم اتنی بات تو صاف ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کے لئے کس راستے کو ضروری

خیال کرتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ محض تخیّل کے دوش پر اُڑتا رہے اور قوم کے سامنے خیالی جنّت پیش کرتا رہے، نہیں، بیسویں صدی میں ضروری ہے کہ شاعر کا دماغ بھی سائنسی ہو اور وہ گرد و پیش کے ٹھوس حقائق کا جائزہ لے کر اپنے ذہن کے پیر تلے ٹھوس زمین پیدا کرے۔

آزاد کی ایک رباعی ہے مگر وہ بھی کسی قدر مُبہم ہے۔

ہر شے کا ہے انداز بدلنے والا ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا

مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں اک نور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

میرا خیال تو یہ ہے کہ مشرق میں ابھی تاریکیاں متلاطم ہیں اور ان میں ٹکّر ہو رہی ہے اور اس صورت میں کہ ہر حقیقت اک نہج پر پہنچ کر اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتی ہے اس لئے دو قسم کے نور اس تاریکی سے اُبھر سکتے ہیں اور دو قسم کی صُبحیں طلوع ہو سکتی ہیں، کون سی صبح، صُبحِ کاذب ہو گی اور کون سی صبح، صبحِ صادق، اس کا اندازہ مجھے آزاد کے کلام سے نہیں ہو سکا۔

آزاد کی ایک نظم ہے "شکنتلا" جو انھوں نے اپنی شریکِ حیات کے حادثۂ مرگ سے متاثّر ہو کر لکھی ہے۔ اس نظم میں بلا کی سادگی اور سچّائی ہے اور آخری اشعار میں وہی تاثّرات کروٹیں لے رہے ہیں جو اقبال کی نظم "ماں کی یاد میں" میں متلاطم ہیں۔ شریکِ حیات

کے متعلق دوسری نظم "ایک آرزو" ہے۔ اس نظم میں جذبات کے ساتھ فلسفے کی رنگ آمیزی اور شاعرانہ اندازِ بیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

"سبھاش چندر بوس" ایک نظم ہے جس میں حب الوطنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میری نظر میں اُن کی یہی ایک نظم اس صداقت کے لیے کافی ہے کہ

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

میری نظر میں آزاد کا ادبی میلان صحیح راستے پر گامزن ہے، جو نقوش ابھی مدھم ہیں، وقت انھیں خود اُجاگر کرے گا۔ اُن کے یہ اشعار تندرست ادب کے رجحانات کا آئینہ دار ہیں ؎

بہبودِ دلِ نیز کے یہ اگر کام نہ آئی کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوانی
اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی
جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو وہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی

آزاد کے کلام پر خوش آئند مستقبل کا پرتو پڑ رہا ہے ؏ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

دہلی ۱۹۵۰ء

(مطبوعہ "جادہ" بھوپال)

ستاروں سے ذرّوں تک



جگن ناتھ آزاد اور ایران کے کلچرل کونسلر آقائے طباطبائی

حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (نزد جامع مسجد دہلی) پر

ستاروں سے ذرّوں تک

وقار عظیم

دنیا خاصے زمانے تک شاعری کو ملہم غیب کے الطاف و اکرام کا صدقہ، واردات قلبی کا مرقع اور وجدانی مظاہر کا آئینہ سمجھتی اور کہتی رہی ہے اور اس لئے اس نے انسانی ادراک اور قوّتِ ارادہ کو شاعری میں صرف اس حد تک اہم جانا ہے کہ جو کچھ الہام وجدان اور کشفِ صدر کی بدولت شاعر کے دل پہ وارد ہو۔ اُسے وہ تزئینِ ظاہری سے آراستہ کر سکے۔ انسان کا خارجی ماحول اور اس کی گوناگونی براہِ راست شاعر کے ذہن کو متاثر نہیں کرتی۔ بلکہ بالواسطہ اس پر صادر ہوتا ہے وہ اسے بنا سنوار کر شعر بنا دیتا ہے۔ اگر شاعری اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ شاعری نہیں کچھ اور ہے۔ زمانے کی یہ آواز کچھ ایسی سحر آگیں تھی کہ شعر و سخن کے رسیا اسی کو شعر

کے نغمہ و ترنّم کی رُوح سمجھتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زمانہ میں اس بلند آہنگ نعرے کے پیچھے ایک احتجاج اور بے یقینی کی ایک ہلکی سی لہر بھی موجود رہی ہے۔ ہر زمانے میں کچھ لوگ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ شاعری کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔ وہ زندگی کی وسعت اور ہم آہنگی کی ترجمان ہے۔

نئے زمانے نے احتجاج کی اس آواز کو بہت اُبھارا اور شاعری کے مفہوم کو بے حد وسیع کیا ہے۔ لیکن دنیا کی پرورش تو ہنگاموں پر ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ ایک اور ہنگامہ آگیا اور ادب اور شعر ہیں ہر زمانے کے لئے دو گروہ بن گئے اور پھر یہ ہُوا کہ ان دونوں راستوں پر الگ چلنے کا دعویٰ کرنے والوں نے اپنے آپ کو بیک وقت دونوں راستوں پر چلتا ہوا پایا۔ نہ کوئی شاعر خالص داخلی ہے اور نہ خالص خارجی مظاہر کا مصور۔ اس کا مشاہدہ اُسے گرد و پیش کی زندگی کے ادراک پر مجبور کرتا ہے۔ اور اس کی شاعرانہ صلاحیت اس ادراک کو نغمے کا لباس پہناتی ہے۔

کچھ عرصہ ہُوا شاعری کا اس طرح کا ایک مجموعہ میری نظر سے گذرا۔ جس میں زندگی اور شاعری کا یہ امتزاج خاص طور پر واضح ہے ——— جگن ناتھ آزاد کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ "ستاروں سے ذرّوں تک"

جگن ناتھ آزاد نے شاعری کے قدیم روایتی اور رچے ہوئے ماحول میں پرورش

پائی ہے۔ اور اس لئے نئے زمانے کے ہر انقلابی اثر کے باوجود ان کی شاعری کی پوری شخصیت میں روایت کا گہرا رنگ رچا ہوا ہے۔ ذہن کے انفرادی رجحانات نے روایت کے اس رنگ کو کس کس طرح اپنا خاص رنگ بنایا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مطالعہ ہے۔

"ستاروں سے ذروں تک" کے مختصر پیش لفظ میں آزاد صاحب نے تھوڑے لفظوں میں اپنی شاعری کی روداد سنائی ہے اور جو کچھ کہا ہے اس سے ان کی شاعری کے محرکات کے سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے میں مدد ملتی ہے۔

آزاد صاحب کہتے ہیں شاعری کے متعلق کسی زمانے میں میں یہی سمجھتا تھا کہ یہ ایک الہامی کیفیت ہے اور آسمان یا اس سے بھی اونچی بلندیوں سے دل شاعر پر نزول کرتی ہے۔ لیکن اب تو جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔

اس بیان کا آخری ٹکڑا بڑا معنی خیز ہے اور ذہن کو شعر کے فن اور اس کی حیثیت کے اختلافی مسئلے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقصدی شاعر کے لئے ارادہ ایک لازمی شرط ہے اور کیا بلا ارادہ ذہن پہ وارد ہونے والی بے مقصد شاعری ارادی ہے اور مقصدی شاعری سے ممتاز نہیں۔ اس کا جواب ——

"ستاروں سے ذرّوں تک" میں موجود ہے۔

"ستاروں سے ذرّوں تک" کی شاعری غمِ جاناں اور غمِ دوراں — دونوں کی شاعری ہے۔

ایک ایسا شاعر جس کا تعلق شاعری سے خود اس کے بیان کے مطابق اگست ۱۹۴۷ء تک بالکل سرسری اور سرِ راہے گاہے ملاقات کا سا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز واقعات سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ جذبات اور خیالات کے بند چھٹے پھوٹ پڑتے ہیں اور شاعری سیلاب بن کر نکلتی ہے۔ لیکن اس زبردست تحریک کے بعد بھی جو شاعری وجود میں آئی ہے وہاں غمِ جاناں کی خلش ہر جگہ موجود ہے۔

مجموعہ کی سب سے پہلی نظم میرا موضوعِ سخن ۲۹ بندوں اور ۶ صفحوں کی طویل نظم ہے اور آزاد صاحب کے رنگِ سخن، ان کی افتادِ مزاج اور فن و شعر کے نقطۂ نظر کی نمائندگی اور وضاحت کرتی ہے۔

شاعر کا خیال ہے کہ اس وقت انسان اور انسانیت کو اس کی اور اس کے فن کی مدد کی ضرورت ہے اور اس لئے وہ کہتا ہے کہ ع میں کہ فن کار ہوں تبلیغ بھی ہے کام مرا

تبلیغ کا یہ دور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک شقاوت اور بدبختی کا زمانہ دورِ مسرت نہ بن جائے۔ اس دورِ مسرت کی آمد پر شاعر کا فکرِ جمیل پھر اپنی دنیائے طرب ناک میں لوٹ آئے گا اور یہاں آکر کبھی تاروں سے اُلجھے گا، کبھی کہکشاں سے کبھی افلاک

کی سرحدوں سے پرے گزر کر دم لے گا، کبھی مے خوار گھٹاؤں کا طواف کرے گا اور کبھی یہ مست بہاروں میں سکون پائے گا اور مہتاب جمالوں اور زہرہ جبینوں کی دُنیا اس کی دنیا ہوگی۔

دنیا کی الم ناک تاریکیوں اور حسن و نغمہ کی اس دُنیا کے درمیان اُمید کی ایک کرن ہے۔ جس کی طرف سے شاعر کی نظر کبھی نہیں ہٹتی۔ وہ دُنیا کی تاریکیوں میں نور کا رنگ بھرنے کے نصب العین کو پورا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے اور اس جد و جہد میں برابر ایک خوش آئندہ دور کا تصوّر اس کے پیشِ نظر ہے۔ یہ تصوّر غزلوں میں بھی ہے اور نظموں میں بھی۔ ان کی غزلوں کے دو شعر ہیں

فضا میں چمکی نئی تجلّی، زمیں پہ گُونجے نئے ترانے
ہر ایک ذرّہ پکار اُٹھا وہ آرہا ہے نیا زمانہ

غمیں نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے
برنگِ صبحِ درخشاں ہر ایک شام اے دوست

امید کی اس جھلک کے پیچھے ہر جگہ عزم اور حوصلے کا پیام ہے۔ اسی مجموعہ میں ایک نظم "عزائم" ہے وہ اس بلند حوصلگی اور اولو العزمی کی شاعرانہ ترجمانی کرتی ہے۔ اس

کے چیدہ چیدہ شعر سنیئے۔

سست گامی کا گلہ کیا وادیٔ پُرخار میں — جب چلیں گے ہم نئے رستے بناتے جائیں گے

اس جہاں اور اس جہاں کی تلخیوں کے روبرو — رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے

اس جہاں کو بخش کر اے دوست! جنّت کا جمال — قہقہے جنّت کی دُنیا پر لگاتے جائیں گے

آزاد کی شاعری غمِ دوست، غمِ دوراں اور اس سے بھی الگ، ایک اور تیسرے غم کی مصوری ہے

غمِ جاناں سے بھی آگے، غمِ دوراں سے بھی آگے
اک ایسا غم بھی ہے الفاظ میں جو آ نہیں سکتا

یہ تینوں غم امید، حوصلہ، ولولہ، عزم یہ آزاد کی شاعری کے موضوع ہیں۔ ان موضوعات کو اپنانے میں آزاد نے روایت اور بغاوت دونوں کو سینے سے لگایا ہے۔ نئی بات کہنے کے لئے پُرانے اشاروں سے کام لیا ہے۔ بدلی ہوئی فضا میں اپنے نغموں کا رنگ بدلا ہے اور سب کچھ پڑھتے وقت کہیں کہیں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے بھی زیادہ تلخ ہیں۔ اور ان میں درد کی کسک اور احساسِ غم کی تڑپ اتنی شدید اور اتنی گہری ہے کہ پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے باشندے ہیں لیکن سیاسی مجبوریوں نے بھی ان کے وطن کی یاد ان سے

نہیں چھپیں۔ مجموعہ میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "سیرِ پاکستان" اس کے پہلے بند میں شاعر طیارے سے مخاطب ہے اور اس سے کہتا ہے کہ

آزاد کو یارانِ وطن میں لے جا
آزاد کے منتظر ہیں یارانِ وطن

دوسرے بند میں اس بات پر اظہارِ مسرت ہے کہ مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا ہے تیسرا بند واپسی کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے آخری دو شعر درد کی اس کسک کا آئینہ ہیں جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔

اے کاش نہ یوں جلد پلٹ آتا میں
دل میں نہ غمِ تازہ بسالاتا میں

اے کاش ذرا اور ٹھہر جاتا میں
اشجارِ وطن کی چھاؤں میں دم لینے

ہندوستان میں اُردو کو مٹتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کا دل نیم بسمل بن جاتا ہے

خوشبو یہ فضا کو پھر نہ مہکائے گی
اُردو کو مٹاؤ گے تو مٹ جائے گی

تہذیب میں کس قدر کمی آئے گی
لیکن یہ خبر بھی ہے اے دیوانو

آزاد کے اس مجموعۂ کلام کو پڑھتے وقت جا بجا یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے شدید جذبہ کے بیان کرنے کے لئے موزوں لفظوں کی اشد ضرورت ہے اور کہیں وہ محض قافیہ کی رعایت اور وزن کی پابندی سے مجبور ہو کر ایسے لفظوں پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے احساس کے صحیح ترجمان نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات نظموں میں زیادہ ہے غزلوں میں شاید

ہی کہیں ہو - اور اس کی وجہ وُہی ہے جو اس مضمون کے شروع میں میں نے بیان کی تھی۔

—— آزاد صاحب کی پرورش غزل کے روایتی ماحول میں ہوئی ہے اور ان کی شخصیت اس میں رچی ہوئی ہے - اس لئے یہ کہنے کے باوجود کہ ؎

دیارِ دوست کو اب کون جا سکے گا ندیم
دیارِ دوست کی اب رہگزر تلاش نہ کر

وہ غزل کے ایسے شعر کہنے پر قادر ہیں

زندگی ہے تمام سوز و گداز
اے غمِ دوست تیری عمر دراز
——
ہزاروں بار آیا ہے جنوں امداد کو لیکن
ہزاروں بار کھایا ہے فریبِ آگہی میں نے
——
دلِ ناداں یہاں خاموش رہنا
نہ ہو جائے مزاجِ دوست برہم
——
پیامِ دوست بن کر آ رہی ہے
نوائے دل ربائے آبشاراں

اور یہ اس بات کے شاہد ہیں کہ غزل کسی ایک خاص زمانے کی چیز نہیں - وہ ہر زمانے میں زندہ رہ سکتی ہے۔

ریڈیو پاکستان لاہور ۱۹۵۲ء

ساہتیہ اکیڈمی کی ایک تقریب میں



پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ

ستاروں سے ذروں تک

آلِ احمد سرور

جگن ناتھ آزاد کا پہلا مجموعہ "بیکراں" ۱۹۴۹ء کے آخر میں چھپا تھا اور اس نے جدید اردو شاعری کی محفل میں ایک ایسی نئی شخصیت کو روشناس کیا جو زندگی کے نئے میلانات کو ہماری بہترین فنی روایات اور سانچوں میں سموئے ہوئے تھی۔ نئے مجموعے میں وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو شاعر نے ۱۹۴۹ء کے آخر اور ۱۹۵۰ء میں کہیں۔ اس مجموعے کے مطالعے سے دو باتوں کا فوراً احساس ہوتا ہے۔ آزاد کے یہاں بڑی قدرت روانی اور فنی پختگی ہے اور وہ بڑا احساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ اور ان کے یہاں آمد زیادہ ہے اور آورد کم۔ انھوں نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور پہلی نظم "موضوعِ سخن" میں بھی نئے شاعر کے دائرۂ فکر کا بڑا اچھا جواز پیش

کیا ہے۔ ان کے یہاں نئے اور بدلے ہوئے حالات کا مطالعہ اور انسانیت کے سمندر میں اضافہ کرنے کا عزم ملتا ہے۔ ان کے یہاں نئے رجحانات کے ساتھ مشرقی کلاسیکل ادب کی روح اور زندگی کے جمالیاتی پہلو کا احساس بھی ہے۔ ان کی شاعری مقصدی ہے اور اس میں مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت کا بھی سامان ملتا ہے۔ ان کے یہاں فن کار کی ایک خلش، بے چینی اور غم بھی ہے۔ یہ دراصل اس دردِ لادوا کا دوسرا نام ہے جو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتا ہے اور جس کے مرحلہ ہائے شوق کبھی طے نہیں ہوتے۔ میں اسے شاعر کے لئے ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔ اسی غم میں اس کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

"بیکراں" میں ایک انسان دوست مہذب اور دردمند دل کی پکار تھی "ستاروں سے ذرّوں تک" ایک ایسے شاعر کی للکار ہے جو زندگی کے معنی و مقصد کو سمجھنے لگا ہے اور موجودہ دور کی تاریکیوں کو ایک روشن مستقبل کی جانب لے جانے کا عزم رکھتا ہے۔ "بیکراں" میں جو اشارے تھے وہ اس مجموعے میں زیادہ واضح اور روشن ہو گئے ہیں۔ "موضوعِ سخن" "اے امیرِ کارواں" "زندگی" "جشنِ آزادی" "جب حجابات اُٹھے" "ایک دوست کے نام" "ایک کتاب کی ضبطی پر" اور "رو کلا سے پیرس تک" ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ "موضوعِ سخن" میں شاعر تخیّل کے سمن زاروں اور مہتاب کے نظّاروں سے گزر کر گلشنِ ہستی کے بہار

و خزاں اور خصوصاً نئے ہندوستان کے ان مسائل کی طرف آتا ہے جو آج ہر سینے کا زخم بنے ہوئے ہیں۔ شاعر دنیا کے اس نظام کی اس ابتری کو دیکھتا ہے تو اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے ؎

جب تک اے دوست یہی ہے مری دنیا کا نظام — مرا موضوع بھی تبدیل نہیں ہو سکتا
فقط اک مردہ و بے رنگ تنوّع کے لئے — اپنے مقصد کو مرا فکر نہیں کھو سکتا

اس نظم میں جا بجا آزاد نے بڑی خوبی سے موجودہ زندگی کے داغوں کو آئینہ کر دیا ہے۔

نو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسرور نہ ہو — نو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے
آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد — دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے
جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں — عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے
عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں — درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

آزاد کی خوبی یہ ہے کہ جب بہت سے ذہین اور حسّاس شعرا اس دورِ جنوں میں افسردگی اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت بھی انھوں نے انسانیت پر اپنا یقین نہیں چھوڑا اور زندگی میں نور و ظلمت کی کشمکش اور انسانیت کا دب دب کے ابھرنا انھیں برابر یاد رہا۔ یہ بڑا صحت مند رجحان ہے جس سے آزاد کی شاعری کے ایک روشن مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔

تیرگی ایک عالم پہ چھاتی رہی

لیکن ایسے میں بھی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

جب انھیں نوید جشنِ آزادی سنائی جاتی ہے تو انھیں پہلا جشنِ آزادی یاد آجاتا ہے اور اس کی یاد سینکڑوں ٹیسیں اور چوٹیں اپنے ساتھ لاتی ہے۔ مگر وہ اپنے دوستوں سے برابر یہی کہے جاتے ہیں۔

دہر کو حل نہ سکا اندک لبیاد کا حل ۔۔۔ آ کہ حل مسئلۂ اندک دلبیادہ کریں

روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدت سے ۔۔۔ ذہنِ انساں کو اب اس دور میں بیدار کریں

آزاد اگرچہ انسانیت اور ترقی کے علمبردار ہیں اور ان کی شاعری کی یہ نمایاں خصوصیت ہے مگر ان کے یہاں فطرت کے حسن اور حسنِ خوباں دونوں کا ایک گہرا رنگ ملتا ہے۔ جھیل ڈل پر نظم اس کی مثال ہے۔ ان کی غزلوں میں ترنم، تاثیر اور ایک نیا درد ہے۔ یہ اشعار ہمیں فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

کبھی وہ دن تھے اپنے دل کو ہم اپنا نہ کہتے تھے

مگر اب ہر بشر کے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں

غمِ جاناں سے بھی آگے غمِ دوراں سے بھی آگے ۔۔۔ اک ایسا غم بھی ہے الفاظ میں جو آ نہیں سکتا

یہی آنکھیں کہ ہیں دورِ خزاں کی اب تماشائی

انھیں آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ زندگی میں نے

اے اہلِ زنداں آنکھیں تو کھولو ٹوٹے پڑے ہیں بند و سلاسل

نصیب سبزۂ خوابیدہ کا نہ جاگ سکا چمک چمک کے فسردہ بھی ہو گئی ہے کرن

اب جو تاراج گلستاں ہے بس اتنی ہے خطا ہم نے اک روز بہاروں کی دعا مانگی تھی

آزاد کے اس مجموعہ کے مطالعہ سے جہاں ان کے صحت مند نقطۂ نظر اور شگفتہ اندازِ بیاں کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ آزاد نے ابھی تجربات کی وہ پختگی اور احساس کا وہ انوکھا پن نہیں سیکھا جو معنی خیز اظہار کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اجتماعی مسائل پر مختلف نئے اور انوکھے پہلوؤں سے نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔ آزاد کو چونکہ شعر کا شوق ورثے میں ملا ہے اور انھوں نے فارسی اور اردو کے اساتذہ کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے اس لئے اُن کے یہاں ایک ہمواری اور روانی پائی جاتی ہے۔ یہ روانی ان کے لئے خطرہ بھی ہے لیکن چونکہ شاعر کا ذہن بیدار ہے اور اس کا دل صحیح جگہ پر ہے اس لئے یہ امید بندھتی ہے کہ اس کے یہاں جلد ایک انفرادی اور مخصوص لے پیدا ہو جائے گی۔ آزاد کو چونکہ فن پر عبور ہے اس لئے ان کی پابند نظمیں ان تجربوں سے بہتر ہیں جو انھوں نے بے قافیہ اور آزاد نظموں کی مقبولیت کو دیکھ کر کئے ہیں۔ ان کے قطعات میں بھی بڑی شہرت اور

تاثیر ہے۔ نئے زمانے کا ان کا تصور ابھی ایک رومانی سا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ وہ ایک حقیقت پسند کی نظر سے کرتے ہیں مگر مستقبل کی تصویر میں اُن پر رومانیت غالب ہو جاتی ہے، شاعر کے یہاں ایک حد تک یہ ناگزیر ہے مگر امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ حقائق کو رومان کے سنہرے غلاف میں نہیں بلکہ اُن کے اپنے نکھرے اور ستھرے رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں گے۔

اُردو ادب (علی گڑھ)
جنوری و اپریل ۱۹۵۱ء

میرا موضوعِ سخن

جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم

مانی جائسی

میرے دہلی کے اس سفر کو کئی مہینے گزر چکے ہیں جس میں جگن ناتھ آزاد نے اپنا مجموعۂ منظومات "ستاروں سے ذرّوں تک" بڑی محبّت سے مجھے دیا تھا۔ میں نے دہلی کے تقریباً ایک ہفتے کے قیام میں وقتاً فوقتاً پورا مجموعہ دیکھ کر آزاد صاحب کو ان کے جذباتِ صادق، سلیقۂ نظم اور حسنِ بیان کی داد بھی بقدر اپنی استعدادِ فہم کے دی تھی اور ارادہ تھا کہ ذرا تفصیل سے اس کتاب کے متعلق اپنے محسوسات کا اظہار کر کے اس ہونہار اور مآل اندیش نوجوان کو اپنے حوصلے کے مطابق اربابِ فہم سے روشناس کروں۔ ہرچند کہ اُن کی شہرت نے اب انہیں تعارف کا محتاج نہیں رکھا۔ لیکن ایسے افکار و مکارہ میں مبتلا رہا کہ بالکل وقت نہ ملا۔ آج اتفاقاً پھر وہ مجموعہ سامنے آیا اور اس کے مطالعے کو میں نے

پھر اس کام میں لانا چاہا کہ دورِ حاضر کی کشمکش اور ہر سانس کے فیصلے کو جو جزوِ زندگی بنے ہوئے ہیں تھوڑی دیر کے لئے دل سے محو کر دوں، بھلا دوں اور دل بہلا لوں۔

پہلی ہی نظم "میرا موضوعِ سخن" دیکھ چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تبصرہ کرتا ہوا آگے بڑھوں۔

عمومی حیثیت سے اس نظم کی سلاست، روانی، دلچسپی، بیان کی صفائی اور بیش لفظ سے ہم آہنگی اس نظم کی کھلی ہوئی خوبیاں ہیں لیکن ان کو میں صرف ملبوسات کا درجہ دیتا ہوں اور ان ملبوسات میں جو پیکرِ صداقت ملفوف ہے اس کے عناصرِ ترکیبی ہیں آزادیٔ خیال، مطالعۂ ماضی و حال اور بینشِ مستقبل اور ان سب کے نتیجے میں نظم کی پُر اثری۔

آزاد نے اس نظم کی ابتدا تو کی ہے کسی دوست کی شکایت کے جواب سے جس میں انھوں نے "تخیل کے سمن زاروں" سے گریز کر کے حقائق کے میدانوں کی خاک چھاننے کے اسباب بیان کئے ہیں اور اس بیانِ اسلوب کے سلسلے میں ان حقیقتوں کے چہرے بے نقاب کئے ہیں جو دراصل معاشرت، تمدن اور انسانیت کے لئے سرمایۂ صد ہزار ننگ و عار ہیں۔ آزاد کی نظم ان بلند بانگ کھوکھلے وعدوں کی آئینہ دار ہے جن کے سہارے آزادیٔ ملک جیسی اہم منزل سر کی گئی اور جن کی یاد میں اب کسی شاعر کا یہ مصرع کافی ہے۔

کیسی آنکھیں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد

اس عام پسند مطلب کے پسِ پشت جو خود مطلبی تھی اور جس کا مظاہرہ صورتِ حالات سے ہو رہا ہے اسے بھی آزاد نے اس نظم میں نمایاں کر دیا ہے۔ وہ لطیف استعارہ اس نظم کے بہت اہم جزو ہیں جن میں مزدور دوستی اور سرمایہ دشمنی کی نمائشِ ابتدائی اور اس کے بالکل خلاف عمل برائی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ یہ اشارے اس قدر مبنی بر حقیقت ہیں کہ آزاد کی تحریک کو کامیابی کی سند دیتے ہوئے انسان کے دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

نظم کو شروع سے آخر تک پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا تو ہلکے سے توجّہ سے ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ ایک مہیب طوفان برپا ہو گیا اور ابھی انتہا کی خبر نہیں۔ یہ میں نے آزاد کے تلاطم جذبات کے متعلق عرض کیا ہے ورنہ مطمحِ نظر اور اُس کی سکون آفرینی کی خبر تو آخری چند بندوں میں موجود ہے اور بڑے امید افزا اور تسلی بخش الفاظ میں ہے۔ یہ خبر اس بند سے شروع ہوتی ہے

گرچہ انساں ہے زبوں حال اگرچہ میں اے دوست
دورِ مستقبلِ انساں سے نہیں ہوں مایوس

مجھ کو امید بہت ابرِ گہر بار سے ہے
میں ابھی خاکِ گلستاں سے نہیں ہوں مایوس

گرچہ بکھرا ہوا سامان ہے مے خانے کا
میں اس انداز کے ساماں سے نہیں ہوں مایوس

اور اس بند پر ختم ہوتی ہے

وقت کے ساتھ جو دو ہاتھ کرے گا کوئی
وقت کے ایک ہی سیلاب میں بہہ جائے گا

دورِ جمہور میں جمہور سے لڑنے والا
صورتِ حرفِ غلط دہر سے مٹ جائے گا

شورشِ محفلِ عالم نہ سمجھنے والا
ابدی نیند کے دامن میں سکوں پائے گا

وقت کی تندیٔ سیلاب نہ چھوڑے گی اسے
آج جو وقت کے سیلاب سے ٹکرائے گا

اسی سیلاب سے دُھل جائے گا رُوئے گیتی
خود بخود ایک نیا دَور نظر آئے گا

یہ نیا دورِ جہاں دورِ مسرّت بن کر
پیرہن دہر کو انصاف کا پہنائے گا

یہ شقاوت کا زمانہ نہ رہے گا باقی
اور خوش بختیٔ افراد کا وقت آئے گا

ختم ہو جائے گا تقدیر کا موہوم فریب
آدم اس دَور میں کردار پہ اترائے گا

گرم اشعارِ جنوں خیز میں ہے جس کی چمک
نور وہ چہرۂ انساں پہ نظر آئے گا

فسقِ سرمایہ پہ محنّت کا تقدّس لٹ جائے
یہ سماں دیدۂ انساں کو نہ تڑپائے گا

وہ اخوّت جو کتابوں میں نظر آتی ہے
اس کا اب نورِ سرِ بزم نظر آئے گا

عالمِ پاک میں فردوس کوئی ہے تو اُسے
خاک اور خاک کی تقدیر پہ رشک آئے گا

ارادہ تو یہ تھا کہ پوری کتاب پر ایک بار تبصرہ کر دیتا لیکن اتنا وقت نہ ملے۔ اور اس اختصار پر اکتفا کرنے کی شرح خود آزاد کی زیرِ تبصرہ نظم کے ابتدائی بندوں میں

مل جائے گی جن کے مختلف اشعار جا بجا ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ باقی منظومات پر شاید پھر کبھی کچھ لکھ سکوں، بشرطیکہ زمانہ فرصت دے اور کشاکشِ زندگی ہی میں سہی چند دقیقے اس طرف متوجہ ہونے کے لئے نکل سکیں۔

اب آزاد کے وہی کچھ اشعار لکھ کر یہ مضمون ختم کرتا ہوں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

حرف گیری تو مرے فن پہ ہے آسان مگر
کس قدر درہم و برہم ہے جہاں یہ بھی تو دیکھ

جہل کی قدر تو اس وقت بھی ہے چار طرف
علم کا کوئی نہیں مرتبہ داں یہ بھی تو دیکھ

تھی زبانوں پہ تمدن کی حفاظت لیکن
مٹ گیا آج تمدن کا نشاں یہ بھی تو دیکھ

جن کو نغمات سمجھتے تھے زمانے والے
وہ حقیقت میں ہے فریاد و فغاں یہ بھی تو دیکھ

اب بھی سرمایہ کے ہاتھوں وہی پہلے کی طرح
تیغ ہے گردنِ محنت پہ رواں یہ بھی تو دیکھ

سیم و زر میں ادھر انسان کو تلتا دیکھے
ادھر انسان بھکاری نظر آئے تجھ کو

عدل و انصاف کے دعوے وہ مساوات کے راگ
ہو گئے کون سے پردوں میں نہاں آخر کار

کیا تماشا ہے کہ آوارہ پھریں محنت کش
اور مسند پہ نظر آئیں تن آسانِ وطن

نظم کے جس حصے سے یہ چند اشعار میں نے نقل کئے ہیں یہ کل کی کل دیکھنے کے قابل ہے یعنی پہلے بند سے اٹھارھویں بند تک۔ ہر بند ہر شعر اپنی جگہ ایک عریاں حقیقت ہے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں است

ایسی اصلاحی نظموں پر جو حقیقی جذبات اور صحیح احساسات پر مبنی ہونے کے علاوہ طولانی بھی ہوں جیسے مسدسِ حالی، فنی حیثیت سے میرے حدودِ تبصرہ سے خارج ہے۔

دہلی ۱۹۵۲ء

(مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد، دکن)

جمنا کے کنارے (سردیوں کی ایک دوپہر)



جگن ناتھ آزاد - عرش ملسیانی - کانتی چندر سون رکشا

آزاد کا نیا مجموعۂ کلام

— تیغ الہ آبادی

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو کے کلاسیکی شعری ادب میں زمین کی عظمت کا احساس نہیں رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جدید شعری ادب نے اس موضوع کو مقصد بنا کر پیش کیا ہے اور یہ مقصد بنیادی طور پر متقدمین اور متوسطین کے سیاسی اور معاشرتی نظریے سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اُردو ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ادب کا وہ حصہ جو بلند کہلایا جاتا ہے ستاروں کی گردش سے اپنا دامن بچا کر ریگ زار کی طرف مسلسل ہمکنار رہا ہے۔ اب سے تین سو بیالیس برس پیشتر شیکسپئر نے لکھا تھا

میری محبوبہ کی آنکھوں میں سورج کی تابندگی نہیں ہے

اُس کے لبوں کی سُرخی سے مرجاں کہیں زیادہ سُرخ ہے

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کسی آسمانی دیوی کو چلتا نہیں دیکھا
میری محبوبہ جب وہ چلتی ہے تو میں اُسے زمین پر ہی چلتے
دیکھتا ہوں۔

ان اشعار میں وہی جذبہ کارفرما ہے جو شدید رومانیت کو رومانیت اور کلاسکیت کے لطیف امتزاج سے علیحدہ کرتا ہے —— وہی جذبہ جو شراب کے پہلے جرعے کی طرح سفوکلیس اور یوریپیڈیز کے خالصتاً مذہبی ڈراموں میں بھی سرسرانے لگتا ہے۔

اردو میں اس جذبے کو اقبال نے سب سے پہلے مقصد بنا کر پیش کیا۔ جوش کے لہجے میں اقبال کی آواز سے زیادہ توانائی تھی۔ اسی لئے جو بات اقبال کے واسطے ہمیشہ دھندلکوں میں کھوئی رہی اُسے جوش نے واضح اور جامع طور پر ایک مصرعے میں کہہ دیا

ع   ہم آسمان سے لاتے نہیں زمینوں کو

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کا اثر بھی قبول کیا ہے اور جوش کا بھی۔ لیکن اُن کی انفرادیت انھیں سستی نقالی سے علیحدہ رکھتی ہے۔ "ایک رئیس کے نام" اور "ایک کتاب کی ضبطی پر" میں جوش کا لہجہ صاف جھلکتا ہے۔ مجموعے کی آخری غزل سے پہلے کی تین غزلیں اقبال کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن "زندگی" اور "جب حجاب اُٹھے"

جیسی نظمیں خالصتاً آزاد کی ہیں۔

"بیکراں" کا شاعر جس ماحول کا شکوہ کر رہا تھا وہ ماحول "ستاروں سے ذرّوں تک" کے شاعر کے لئے اور بھی بھیانک ہو گیا۔ اس میں صرف نظامِ حکومت ہی کا قصور نہیں تھا بلکہ اس غلطی کا بھی اثر تھا جس کا احساس اب بڑی طرح عوامی تحریک کو ہو رہا ہے۔ عوامی تحریک نے انقلاب کی صحیح منزل کو نہیں سمجھا تھا۔ جگن ناتھ آزاد چونکہ اس تحریک سے براہِ راست وابستہ نہیں تھے اس لئے وہ اس غلطی سے تو بچ گئے لیکن بیکراں کی غلطی یہی رہی کہ اس میں یہ غلطی نہیں تھی۔ "ستاروں سے ذرّوں تک" میں آزاد کا شعور زیادہ پختہ ہو گیا ہے۔ "مرتی ہوئی سچائی" کا شاعر "جستجو" کے شاعر سے مختلف ہے۔ لیکن ایک مبہم سی تشکیک اب تک باقی ہے اور "منزل ہے کہاں تیری" اس تشکیک کا ثبوت ہے۔ اس میں آزاد اتنے گنہگار نہیں ہیں جتنی "آج کل" کی ادارت ہے۔ لیکن پھر بھی نظم کی پیشانی پر نام تو آزاد ہی کا ہے۔

آزاد کے ہر شعر پر آزاد کی زندگی کے خلوص کی مہریں لگی ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال "میرا موضوعِ سخن" ہے اور سب سے کمزور مثال "غرورِ ادب"۔ "میرا موضوعِ سخن" ایک حیثیت سے اس کتاب کا پیش لفظ ہے۔ فیض کی نظم "موضوعِ سخن" کے مقابلے میں یہاں ایک زیادہ بیدار شعور، ایک بہتر فلسفۂ عمل، ایک پاکیزہ تر منظر یہ ہے۔

اس کے برخلاف "غرورِ ادب" ایک بیمار انانیت کی غمازی ہے۔ جوش کی نظم "غرورِ ادب" کے مقابلے میں یہاں ایک ایسا PRETENTIOUS جذبہ ہے جسے آزاد نے نہ جانے کیوں اُبھرنے دیا۔

آزاد کی مجروح جوانی نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے علاوہ ایک اور مجروح غم کی تلاش کی ہے۔ یہ تلاش واضح طور پر شعوری تلاش ہے۔ اس لئے نہیں کہ آزاد کے الفاظ میں "یہ غم ایک عجیب قسم کی بے بسی کا خلاق ہے" بلکہ اس فلسفے کے ماتحت کہ غم ہی سے قوت پاکر آزاد کی شاعری اپنی تمام تر صلابت کا اظہار کرتی ہے۔ پیش لفظ کے آخری جملوں میں آزاد نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ 'ستاروں سے ذرّوں تک' کا مصنّف کبھی اس غم کو محبوب نہیں رکھ سکتا جو غم بے بسی کا خلّاق ہو۔ جس غم کا سایہ ان نظموں پر پڑ رہا ہے اس میں بے پناہ تخلیقی قوّتیں ہیں۔ یہ اشعار

ہمت نہ ہارو ہمّت نہ ہارو — میرے چمن کی زخمی بہارو
ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں — اے چاند تارو اے چاند تارو
میرے رفیقو وقت آگیا ہے — بزمِ جہاں کا چہرہ نکھارو

ہمیں ایک ایسے ملّاح کی یاد دلاتے ہیں جو سمندر کی طغیانی میں گھر گیا ہو جس کے چہرے پر تیز بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں۔ لیکن جو حوصلے اور یقین کے ساتھ اس عالم میں بھی کھلے

ہوئے موسم کے گیت گا رہا ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو شرمناک واقعات ہندوستان اور پاکستان میں ہوئے ان کا آزاد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس وقت کئی شاعر ایسے تھے جو کم سے کم ایک لمحے کے لئے انسانیت کی ابدی سچائی سے مایوس ہو گئے تھے۔ آزاد کا کرب کبھی مایوسی کی حد تک نہیں پہنچا۔ آزاد نے زیادہ سے زیادہ یہی کہا تھا ؎

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا

زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

اب بھی آزاد کے نزدیک زیست بار ہے لیکن زہر کے برابر نہیں اس لئے کہ اب آزاد اس کے اجتماعی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ دلّی سے آندھرا تک جو جراثیم نمودار ہے تھے انہیں آزاد نے اب سے بہت پہلے سمجھ لیا تھا لیکن اب وہ روکلا سے پیرس تک امنڈتی، اُبھرتی اور گونجتی ہوئی زندگی کے نقش و نگار بھی دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں

زندگی بے نیازِ زمان و مکاں

زندگی بے نیازِ غمِ این و آں

زندگی بے نیازِ بہار و خزاں

تند ماحول میں

گنگناتی رہی ....

آزاد کی نظمیں ہمیں HOGARTH کی مصوری کی یاد دلاتی ہیں۔ آزاد کا قلم بے حد لطیف اور نہایت نازک جذبوں کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کائنات کو پیش کرتا ہے جس کو انسان کی کمزوریوں نے آباد کیا ہے۔ وہ کائنات جو اتنی تیزی سے گردش کر رہی ہے کہ ہم کسی چیز کو جم کر نہیں دیکھ سکتے۔ اپنے مقصد کو زیادہ واضح کرنے کے لئے آزاد نے کئی ایسے موضوع چھوڑ دئے ہیں جن سے عصرِ حاضر کے نوجوان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنسی گھٹن اور پژمردگی، کائنات سے ذہن کے ہم آہنگ نہ ہونے کا احساس اور درمیانی طبقے کے بے پناہ مسائل — آزاد نے ان پر کچھ نہیں لکھا۔ یہ اُن کے دائرے سے باہر کی چیزیں ہیں اور فنکار اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اپنے دائرے کو پہچان لے۔ آزاد کی شاعری اس کا کامیاب ترین نمونہ ہے۔ جب تاریخ کا سیلاب ہمارے بہت سے شاعروں کو بہالے جائے گا۔ جب اس چکراتی ہوئی زندگی کی نبضوں میں سکون آنے لگے گا اُس وقت بھی آزاد کے یہ اشعار لطف اور انبساط کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔

محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع | آج اس تلخ کلامی کا محل ہے کہ نہیں
علم افکار زمانے میں بڑا علم سہی | علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہے کہ نہیں

اے غزل کو غمِ محبوب سمجھنے والے
یہ جواب میں نے سنائی ہے غزل ہے کہ نہیں

الہ آباد ۱۹۵۲ء

(مطبوعہ "پیامِ مشرق" دہلی)

ستاروں سے ذرّوں تک

غلام رسول نازکی

نام بڑا دل فریب ہے اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ کتاب کو اسم بامسمیٰ ثابت کرے۔ 'ستاروں سے ذرّوں تک' ؟ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ ستاروں سے ذرّوں تک جاتے جاتے جو چیز بھی سامنے آتی ہے وہ شاعر کی نظر سے اوجھل نہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ کیونکہ اس کی تیز بین نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یا اس نام کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے شاعر اس وقت تک ستاروں کی کہانیاں بہت کہہ گئے ہیں اور اب ستاروں کی اس خیالی دُنیا سے ذرّوں کی اس حقیقی دنیا میں آ جائیں جسے آج تک شاعروں نے اپنی توجہ کا مرکز بنانے کے شایاں نہ سمجھا۔ کتاب کی فہرستِ مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے نام کی یہ دوسری توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس نظر آتی ہے۔ ان ذرّوں

میں جگن ناتھ آزاد کو سمندِ فکر پر ایڑ لگانے کے مختلف موقعے ملتے ہیں اور وہ ان ذرّوں میں اپنی قوم اور اپنے سماج کی صحیح تصویر تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والے کو سب سے پہلے تذبذب کی دنیا سے اقبال کے دو شعر سنا کر نکالتا ہے

اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا وہ گہر کیا　　جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا　　شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو

ظاہر ہے کہ جگن ناتھ آزاد ستاروں سے ذرّوں تک سفر کرتے وقت اس خیال کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ ایک ایسا قطرہ ہے جس سے دلِ دریا متلاطم ہو جاتا ہے۔ وہ بادِ سحر کا ایسا جھونکا نہیں جو چمن کو افسردہ کرے۔ وہ اپنی نوا سے حریمِ ذات میں بھی شور ڈالنا چاہتا ہے اور بتکدۂ صفات سے بھی غلغلہ ہائے الاماں بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ "میرا موضوعِ سخن" کے عنوان سے رہے سہے شکوک و شبہات دُور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دوست مجھ پر تنقید کرتے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ

ابر کے کیف سے مہتاب کے نظّاروں سے　　مرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ

آزاد کو اس کا اعتراف ہے اور وہ کہتا ہے

اب نہ رنگینیٔ مغرب ہے نہ ہے بادِ شمال　　یہ بجا ہے کہ مرے فکرِ سخن کی زد میں
پھر کہاں حسن و تجلّی کی لطافت کا سوال　　کیونکہ ظلمتیں نور سے جب دست و گریباں ہو جائیں

آزاد اپنے نکتہ چین کو تسلی بخش جواب دینے کے لئے اپنے ماحول کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں رنگینیٔ مغرب اور بادِ شمال کا ذکر کیسے کروں جب مجھے ہر چار طرف سے بے اطمینانی کا ایک کریہہ منظر نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اور کاش تو بھی اسے دیکھ سکے کہ آدم آدم کا شکاری ہے۔ ہر وہ شخص نفرت کا پجاری ہے جس کی زبان پر اخلاص کے دعوے ہیں۔ ہر وہ انسان شیطان کا حواری ہے جو دنیا والوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ یزداں کا پرستار ہے۔ ایک طرف سے آدمی لعل و زر میں تلتا ہے اور دوسری طرف سے ہزاروں مائیں اور لاکھوں بچے جسم اور جان کا رابطہ قائم رکھنے کے لئے دردر کی ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب صورت ایسی ہو تو شاعر نغمۂ شادمانی گا نہیں سکتا۔ مگر وہ پھر کیا کرے گا؟ کیا وہ روئے گا۔ کیا وہ مایوس ہو کر ماتم کرے گا۔ نہیں وہ روتا نہیں۔ ماتم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ میرا فکر ایک عالمِ نو کی تعمیر میں مصروف ہے

میں کہ فن کار ہوں تبلیغ بھی ہے کام مرا   مجھ کو اس بات کے اظہار سے کچھ عار نہیں

اُسے چرخ پر ایک تجلی نظر آتی ہے جس کی ضیا زمین پر چاروں طرف پھیلتی جاتی ہے۔ اس تجلی سے نور کے چشمے پھوٹے پڑتے ہیں وہ قیدِ حدود و تصور سے آزاد ہے۔ اس نے اذان و ناقوس کی آواز سنی بھی نہیں۔ یہ نور ایک ابدی نور ہے جس میں کبھی کمی نہیں

آتی۔ اس نور کی کرنوں سے ایک جہانِ نو کی تعمیر ہوگی۔ یہ جہانِ نو دورِ مسرّت بن کر دہر کو پیرہنِ انصاف پہنائے گا۔ ہر طرف خوش بختی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اسی دور کا منّاد ہوں۔ اسی دور کا مبلّغ ہوں۔ جب وہ دور آئے گا تو پھر مجھ سے اس شعر کی تمنّا کر جہاں میرا فکر کہیں کہکشاں سے اُلجھے گا اور کبھی تاروں سے۔ اور کبھی اس کی رفتار اتنی تیز ہوگی کہ وہ سرحدِ افلاک سے بھی آگے گذر جائے گا۔

کہکشاں سے کبھی اُلجھے گا کبھی تاروں سے ——— کبھی افلاک کی سرحد سے گزر جائے گا
یہ کرے گا کبھی مے خوار گھٹاؤں کا طواف ——— کبھی بدمست بہاروں میں سکوں پائے گا
کبھی مہتاب جمالوں میں ملے گا تجھ کو ——— اور کبھی زہرہ جبینوں میں نظر آئے گا

پھر گلہ تجھ کو نہ ہوگا کہ مرا فکرِ جمیل ——— بھاگ نکلا ہے تخیّل کے سمن زاروں سے
میں نے ڈھونڈی ہے زمانے کے اندھیروں میں پناہ ——— دور گردوں کے دمکتے ہوئے سیّاروں سے
مرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ ——— ابر کے کیف سے مہتاب کے نظاروں سے

نظم بہت طویل ہے اور اندازِ بیان اتنا دل چسپ کہ ایک بار شروع کیجئے ختم ہونے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹے گی۔ ساری کتاب میں یہی تصوّر غالب ہے۔ کتاب میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزلوں میں بھی اسی درد کی شدّت کا احساس نمایاں ہے۔ ذیل میں لکھی ہوئی ایک دل فریب غزل ملاحظہ فرمائیے۔ آزاد کہتا ہے

ہمّت نہ ہارو ہمّت نہ ہارو　　میرے چمن کی زخمی بہارو

طوفاں کی موجیں للکارتی ہیں　　قائم رہوگے کب تک کنارو

ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں　　اے چاند تارو اے چاند تارو

کب تک رہوگے میرے وطن میں　　بے کیف زنگو! خونی نظارو

اے آنے والے ادوارِ تاباں　　میرے قلم پہ سجدے گزارو

بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل　　آزاد اُٹھّو ان کو سنوارو

معلوم ہوتا ہے کہ مجروح ماحول اور زخمی سماج کو دیکھ دیکھ کر شاعر کے ذہن پر متضاد کیفیتیں وارد ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے چمن کی زخمی بہاروں کو دلاسا دیتا ہے کہ وہ ہمّت نہ ہاریں۔ جہاں وہ پر امید ہے کہ کنارے زیادہ دیر تک للکارتی موجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جہاں اُسے نظر آتا ہے کہ ذرّوں کے تیور اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ چاند تارے یہ سرگوشی کرتے سُنائی دیتے ہیں کہ یہ ٹوٹتا ہُوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے۔

آزاد مغربی پاکستان سے ہجرت کر کے دلّی آیا ہے۔ وہ لاہور میں پیدا ہُوا۔ وہیں تعلیم پائی اور وہیں کی ادبی محفلوں میں اپنے ذوقِ ادب کو پروان چڑھایا۔ تقسیمِ ملک نے آزاد کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس کے کلام سے ہر جگہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اسے اپنے وطن کی یاد بُری طرح ستا رہی ہے۔ تقسیم اور ہجرت

کے بعد وہ غالباً ایک بار طیارے میں لاہور گیا۔ اس سفر کے تاثرات اُس نے سیرِ پاکستان کے عنوان سے چند رباعیوں میں ظاہر کئے ہیں۔ طیارے سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

گذرے ہوئے دور کو بلانے والے　　بچھڑی ہوئی دنیا سے ملانے والے
اللہ تجھے اور بیک بال کرے　　اے مجھ کو وطن میں لے کے جانے والے

جب وہ اپنے وطن پہنچا تو اس کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا　　مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن! چمن میں اعلان کرو　　شیدائے چمن چمن میں واپس آیا

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے احباب نے آزاد کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ جب وہ واپس آیا تو اس قسم کے تاثرات لے کر آیا۔

گذرے ہوئے دن یاد دلانے والو　　ہشیار کو دیوانہ بنانے والو
آزاد کو گفتگو کا یارا ہی نہیں　　آزاد کو آنکھوں پہ بٹھانے والو
مانا کہ اُسے درد سے آزاد کیا　　تسلیم کہ ناشاد کو دل شاد کیا
آزاد کو رکھا نہ کہیں کا تم نے　　یوں لطف و کرم سے اس کو برباد کیا

آزاد اُن ادیبوں میں سے ہیں جو اُردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کی ملی جلی تہذیب کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ دشمنی کرنے والوں کو مشترکہ ہندوستانی

تہذیب کے دشمن قرار دیتے ہیں۔ دو ایک رُباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سرشار کا حسنِ داستاں ہے اُردو
محروم و فراق کا بیاں ہے اُردو
اُردو کو ملیچھ کیوں سمجھتے ہو تم
چکبست و سرور کی زباں ہے اُردو

اے اہلِ وطن! یہ داستاں اپنی ہے
اپنی ہے یہ روداد فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو دیوانو
غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

اُردو ہے فقط زبان کہسار نہیں
اک موجِ شمیم ہے یہ تلوار نہیں
مشکل نہیں اُردو کا مٹانا لیکن
کیا اپنے تمدّن سے تمہیں پیار نہیں

ریڈیو کشمیر سری نگر

اپریل سنہ ۱۹۵۱ء

وطن میں اجنبی



کراچی کے ایک مشاعرے کے بعد

وطن میں اجنبی

عبدالمجید سالک

ہندوستان کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ان کی دردناکی کا تذکرہ اب بے کار ہے، کیونکہ ان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اہلِ درد اور درد رسیدہ لوگ جی بھر کے آہ و فغاں نہیں کر چکے۔

بلاشبہ دونوں طرف کے باشندوں نے سیاسی احساسات کے زیرِ اثر ایک دوسرے کے گلے کاٹے، ایک دوسرے کی آبروریزی کی، ایک دوسرے کا مال لُوٹا اور ایسی ناقابلِ تصوّر حرکات کا ارتکاب کیا جس پر انسانیت ہمیشہ خون کے آنسو روتی رہیگی لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سارے ہندو سارے مسلمان اور سارے سکھ درندے نہیں تھے۔ ان قوموں میں ایسے افراد بھی تھے جن کے قلوب

محبّت و دردمندی سے لبریز تھے۔ وہ اختلافِ مذاہب کے باوجود اپنے باپ دادا کے وطن سے پیار کرتے تھے۔ اپنے ہمسائیوں پر بھائیوں کی طرح نثار ہوتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے اچھی باتیں اخذ کرنے میں وسیع المشربی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ وہ ہرگز اپنے آبائی وطنوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کو صرف حالات نے نقلِ مکانی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ وہ مہاجر اور شرنارتھی ہونے کی حالت میں بھی اپنے دلوں کو اپنے قدیم وطنوں کی یاد سے لبریز پاتے ہیں اور جب کبھی ان کو وہ پرانے تعلّقات و روابط یاد آتے ہیں جن کے سائے میں انہوں نے جنم لیا تھا اور پروان چڑھے تھے تو ان کے دلوں پر چوٹ لگتی ہے اور وہ بے اختیار اشک بار ہو جاتے ہیں۔ بے شک سیاسی و عقلی اعتبار سے انہیں اب سینے پر صبر کی سل رکھ کر ماضی کو فراموش کر دینا اور اپنے اپنے نئے وطن سے وابستہ ہو جانا چاہیئے کیونکہ گزرا ہوا زمانہ اب واپس نہیں آئے گا۔ لیکن جذبات پر عقل و خرد کی حکمرانی کب ہوئی ہے۔ کم از کم موجودہ نسل تو غمِ مافات کی آہوں اور یادِ ماضی کے آنسوؤں سے چھٹکارا نہیں پا سکتی، البتہ نئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ نسلیں اس دردناک تاریخ سے بے پروا ہو جائیں تو ہو جائیں۔

جگن ناتھ آزاد اسی قبیل کے وسیع المشرب اور دردمند انسانوں میں سے ہیں۔

تقسیم کے بعد سے ان کی شاعری اسی جذبۂ فراق کی آہوں اور سسکیوں کی سرمایہ دار بن کر رہ گئی ہے۔ وہ آج کل کی زبان میں مسلم ادب اور مسلم کلچر کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ حالانکہ صدہا سال سے یہی ادبی کلچر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ رہا ہے۔ بہرحال آزاد کا یہ اندازِ فکر ایک تو ان کی فطری سعادت کا نتیجہ ہے اور پھر ان کی ولادت و تربیت ضلع میانوالی میں ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی نوے فیصدی سے بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے ہوش کی آنکھ کھولی تو اپنے اردگرد مسلمانوں ہی کو پایا۔ ان کے بچپن کے ہمجولی ان کے لڑکپن کے دوست اور ان کے جوانی کے احباب زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسے پاک نفس اور خوش ذوق باپ کے فرزند تھے جنھوں نے آغاز ہی میں مسلمان قوم اور اردو شاعری سے اپنا رشتۂ مودت استوار کر لیا تھا اور جو معلم ہونے کی وجہ سے ہزاروں مسلمان بچوں کے حسنِ تربیت کے ذمہ دار تھے۔ پھر آزاد نے اعلیٰ تعلیم راولپنڈی اور لاہور میں پائی اور یہاں بھی ان کے احباب کی اکثریت مسلمان تھی اور ان میں سے جو ہندو تھے وہ بھی اپنی افتادِ طبیعت اور اپنے ذوقِ سلیم کی وجہ سے آزاد کی بنیادی، ادبی و معاشرتی تربیت کے معاون ہی رہے۔ لہٰذا آزاد پر اس تنفّر اور انقطاع کا سایہ بھی پڑنے نہ پایا جس نے اکثر ہندوؤں کو مسلمانوں سے کشیدہ و کبیدہ کر دیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد ایک ایسا نہال تھا جو میانوالی کے سنگلاخ اور پنجاب ہی کے میدانوں میں پوری نشو ونما پا سکتا تھا۔ لیکن حالات کے باغباں نے اس کو یہاں سے اکھاڑ کر دہلی میں لگا دیا۔ بعض پودے ناموافق آب و ہوا میں پروان تو چڑھ جاتے ہیں لیکن دورانِ نشو و نما میں کبھی مُرجھا جاتے ہیں۔ کبھی کملائے ہوئے نظر آتے ہیں اور مالی کو ہر وقت ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن جو درد مسلسل ان میں جاری و ساری ہے اس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی طویل نظم ہے جس کے مختلف حصے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔ پہلی مسدّس تو پنجاب کا ایک دردناک مرثیہ ہے اور اس موضوع پر اب تک جو بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں۔ ان میں اپنے درد و اثر کی وجہ سے یہ بہت ممتاز ہے۔

اس کے بعد ترکِ وطن کی مجبوری کا ماتم ہے۔ پھر پاکستان آنے پر اپنے وطن پنجاب سے والہانہ فریفتگی کا اظہار ہے۔ واگہ کی سرحد پر شاعر کے دل پر کیا عالم گزرا

جہانِ شوق کا ہر ذرّہ پیچ و تاب میں ہے   یہ کس نے رُوح کو آواز دی خدا جانے
سُنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشکِ رواں   ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے

وطن میں ایک غریب الدّیار آتا ہے — خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی — عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے

پھر شاعر پاکستان سے ہم کلام ہوتا ہے اور پاکستان اس کو دعوت دیتا ہے کہ "پھر اپنی اُجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ"۔ لاہور کو جو شاعر کے نزدیک کعبۂ علم و فن ہے مخاطب کر کے کہتا ہے۔

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں — چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو — کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا — وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

کس قدر سادہ، کس قدر سلیس اور سہل ممتنع غزل ہے جس کو پاکستانیوں نے جتنی دفعہ بھی آزاد کے پُر درد لہجے میں سنا ہے ان کے دلوں سے ہوکیں اُٹھتی ہیں۔

اس کے بعد اقبال کے مزار پر روحِ اقبال سے باتیں ہوتی ہیں۔ راولپنڈی اور مری سے دعوتیں آتی ہیں لیکن سیاست پابہ زنجیر ہو جاتی ہے اور شاعر تڑپ تڑپ کر اپنے دوستوں سے اپنی مجبوری کا ماجرا کہتا ہے۔ آزاد کو مشرقی پاکستان نے بھی مشاعرہ پر دعوت دی۔ چنانچہ ڈھاکہ اور چٹاگانگ جاتے ہوئے بھی اس نے بعض دلآویز نظمیں لکھی ہیں۔ وہاں حفیظ سے ملاقات ہوئی۔ یہاں حفیظ کی ایک دلآویز غزل اور

اس پر حضرت محروم کی ایک چست اور اُستادانہ تضمین بھی شامل کتاب کر دی گئی ہے۔

لاہور واپس آ کر "پیر رومی اور مرید ہندی" کے انداز پر "اقبال و آزاد" کا ایک مکالمہ مرتّب کیا گیا ہے۔ جس میں آزاد کی طرف سے سوالات کی ترتیب اور اقبال کے کلام سے جوابات کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ مولانا تاجور مرحوم کی روح اپنے عزیز شاگرد کو معنی خیز نصیحتیں کرتی ہے اور آزاد اس کو اپنا کلام سناتے ہیں عالمِ خیال میں سجّاد ظہیر، فیض، احمد ندیم، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اور آخر میں کراچی کا سفر پیش آتا ہے۔ یہاں وہ غزلیں درج کی گئی ہیں جنہوں نے کراچی کے ہر حلقے سے خراجِ اشک و آہ وصول کیا ہے۔

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا — بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا — خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے — بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت وہ والہانہ اثر ہے جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان کی گھلاوٹ، بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اس کو برِ صغیر ہند و پاک کی صفِ اوّل میں جگہ دے دی ہے اور وہ بلاشبہ اس مقام کا مستحق ہے۔

کراچی ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء (مطبوعہ "اقدام" لاہور)

وطن میں اجنبی

جگن ناتھ آزاد کا تیسرا مجموعۂ کلام

اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن جو رُوحِ مسلسل اُن میں جاری و ساری ہے اُس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی طویل نظم ہے جس کے مختلف حصّے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت درد و اثر ہے جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان کی گھلاوٹ بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اُس کو برصغیر ہند و پاک کی صفِ اوّل میں جگہ دے دی ہے اور وُہ بلاشبہ اس مقام کا مستحق ہے۔

عبد المجید سالک

قیمت Rs. 3·50 n.p.

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی ۶